

صله

ایمن علی



صلہ

ایمن علی

علم و عرفان پبلشرز

الحمد مارکیٹ، 40۔ اردو بازار، لاہور

فون: 37352332-37232336

جملہ حقوق بحق مصنفہ محفوظ

نام کتاب	صلہ
مصنفہ	ایمن علی
اہتمام	گل فرازا احمد
مطبع	علم و عرفان پبلشرز لاہور
کمپوزنگ	زاہدہ نوید پرنٹرز لاہور
سن اشاعت	اولیس احمد
قیمت	مارچ 2014ء
	300/- روپے

علم و عرفان پبلشر

40۔ الحمد مارکیٹ، اردو بازار، لاہور

فون 7352332-7232338

..... ملنے کے پتے

وکیلیم بک پورٹ، اردو بازار، کراچی	خزینہ علم و ادب، الکریم مارکیٹ اردو بازار، لاہور
اشرف بک ایجنسی، اقبال روڈ کمیٹی چوک، راولپنڈی	کتاب گھر، اقبال روڈ کمیٹی چوک، راولپنڈی
جہانگیر بکس، بوہڑ گیٹ، ملتان	رشید نیوز ایجنسی، اخبار مارکیٹ، اردو بازار، کراچی
نکسیر بک ڈپو، تلہ گنگ روڈ، چکوال	شع بک ایجنسی، بھوانہ بازار، فیصل آباد

ادارہ کا مقصد ایسی کتب کی اشاعت کرنا ہے جو تحقیق کے لحاظ سے اعلیٰ معیار کی ہوں۔ اس ادارے کے تحت جو کتب شائع ہوں گی اس کا مقصد کسی کی دل آزاری یا کسی کو نقصان پہنچانا نہیں بلکہ اشاعتی دنیا میں ایک نئی جدت پیدا کرنا ہے۔ جب کوئی مصنف کتاب لکھتا ہے تو اس میں اس کی اپنی تحقیق اور اپنے خیالات شامل ہوتے ہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ آپ اور ہمارا ادارہ مصنف کے خیالات اور تحقیق سے متفق ہوں۔ اللہ کے فضل و کرم، انسانی طاقت اور بساط کے مطابق کمپوزنگ طباعت، صحیح اور جلد سازی میں پوری احتیاط کی گئی ہے۔ بشری تقاضے سے اگر کوئی غلطی یا صفحات درست نہ ہوں تو ازراہ کرم مطلع فرمادیں۔ انشاء اللہ اگلے ایڈیشن میں ازالہ کیا جائیگا۔ (ناشر)

انتساب!

ان لوگوں کے نام جو اپنے چھوٹے سے چھوٹے
مخلص عمل کے لیے صلہ کی امید کرتے ہیں۔
جلد بازی کرتے ہیں مگر بھول جاتے ہیں کہ
بیشک خدا اپنی ذات پر کسی کا ادھار نہیں رکھتا۔



کتاب گھر کا پیغام

ادارہ کتاب گھر اردو زبان کی ترقی و ترویج، اردو مصنفین کی موثر پہچان، اور اردو قارئین کے لیے بہترین اور دلچسپ کتب فراہم کرنے کے لیے کام کر رہا ہے۔ اگر آپ سمجھتے ہیں کہ ہم اچھا کام کر رہے ہیں تو اس میں حصہ لیجئے۔ ہمیں آپ کی مدد کی ضرورت ہے۔ کتاب گھر کو مدد دینے کے لیے آپ:

- ۱۔ <http://kitaabghar.com> کا نام اپنے دوست احباب تک پہنچائیے۔
- ۲۔ اگر آپ کے پاس کسی اچھے ناول/کتاب کی کمپوزنگ (ان ایچ فائل) موجود ہے تو اسے دوسروں سے شیئر کرنے کے لیے کتاب گھر کو دیجئے۔
- ۳۔ کتاب گھر پر لگائے گئے اشتہارات کے ذریعے ہمارے سپانسرز کو وزٹ کریں۔ ایک دن میں آپ کی صرف ایک وزٹ ہماری مدد کے لیے کافی ہے۔

اٹھ بھی جاؤ ست لڑکی۔ تین دفعہ آنٹی اٹھا کر جا چکی ہیں۔“ ہمارے اس کے منہ پر سے چادر ہٹائی۔

”کیا مصیبت ہے دفع ہو جاؤ ایک دن ملتا ہے چھٹی کا۔ اس میں بھی تم صبح کے اخبار کی طرح نازل ہو جاتی ہو۔“ وہ جھنجھلا کر اٹھ بیٹھی اور

لبی جماہی لی۔

”محترمہ دن کے بارہ بج رہے ہیں اور کتنا سونا ہے تم نے۔ یقیناً رات بھر کوئی ڈرامہ دیکھتی رہی ہوگی۔ نماز پڑھی تھی فجر کی کہ نہیں؟“ اس

نے اس کے بیڈ پر بکھری ڈی ویڈیو اٹھا کر دیکھیں۔ ”ہائے قسم سے پورا ارادہ تھا پڑھنے کا۔ مگر عین اذان سے 10 منٹ پہلے ایسی گہری نیند آئی کہ بس

منہ لپیٹ کر سو گئی۔ لیپ ٹاپ بھی بند نہیں کیا۔“ اس نے سر کھجاتے پھر جماہی کو روکنے کو منہ پر ہاتھ رکھا۔ ”اف جو کس ہی نکال لیا کرو کبھی۔“ اس نے

شینڈ میں ڈی ویڈیو سیمیٹ کر کے رکھ دیں۔

”کس نے کہا میرے سر میں جو کس ہیں۔ یہ خبر ضرور دادو نے پھیلائی ہوگی ان کے سامنے تو اگر بال سیٹ کرنے کو ہی ہاتھ ڈالو تو فٹ سے

فرما دیں گی کہ فی کڑیے تیرا بیڑہ تر جائے جھکتی نال باریک کنگھی لیا۔ بوت جوئیاں ہو گیاں جے۔“ اس نے دادو کی نقل اتار تے منہ میڑھا کیا اور بال

باندھتی واش روم میں گھس گئی۔ ”یار ڈرامے تو کافی اچھے لگ رہے ہیں ناموں سے ایک تو تمہیں روز نئے بخار چڑھتے ہیں۔ پہلے ساحرہ کاظمی کے

ڈرامے ڈھونڈ ڈھونڈ کر لاتی رہیں اب زرینہ خان کے سارے اٹھالائی ہو۔“ ہمارے ڈی ویڈیو سیٹ کرتے نام پڑھے اس کی بات سنتے وہ تو لیے

سے منہ رگڑتی باہر آئی۔

”یار ابا نے کہا تھا کہ شاہزاد خلیل، ساحرہ کاظمی اور مہرین جبار کے پرانے ڈرامے دیکھو کام میں بہت ہیلپ ملے گی۔ ان تینوں کے

ڈراموں میں زرینہ خان کو دیکھا تو بچ میں مزہ آ گیا۔ اپنی نیچرل ایکٹنگ سے انہوں نے کہانی کو چار چاند لگا دیے۔“ وہ لیپ ٹاپ چار جنگ پر لگا رہی

تھی۔ ”حالانکہ مجھے ایسی جاندارا ایکٹنگ کی ان سے امید نہیں تھی۔“ ہمارے کمرے کا بکھرا سامان سمیٹ رہی تھی۔ ویک اینڈ پر وہ یونہی لیپ ٹاپ

لے کر ساری دنیا سے بے نیاز ڈرامے دیکھتے گزرتی۔ نئے، پرانے، پی ٹی وی کلاسکس، ٹیلی تھیٹر وغیرہ۔ اپنے ابا کے دوست نسیم بادی کے ساتھ وہ

اسٹنٹ ڈائریکٹر کے طور پر کام کرتی تھی۔

”یعنی زرینہ اب تمہیں زیادہ پسند آ گئی ہیں۔ جیسے مجھے اعفان باری پسند ہے۔ ہائے تم کتنی خوش نصیب ہو اس کے ساتھ کام کرتی ہو پھر

بھی مجھے نہیں ملتا اس سے۔“ وہ نروٹھے پن سے بولی۔

”اول تو میں اس کے ساتھ کام نہیں کرتی۔ دوم آج کل کے ایکٹرز کو تو ڈائریکٹر کی ہدایات کی بھی ضرورت نہیں ہوتی تو اسٹنٹ کس کھیت

کی مولی ہے۔ ہدایتکار کو تو بس کمرہ سوچنگ کے لیے ہی رہ گئے ہیں۔ وہ دونوں اب سیڑھیاں اترتی لاؤنج میں آرہی تھی اور میں آجکل کے سپرا سٹار

قسم کے ایکٹرز کو اتنی اہمیت نہیں دیتی کہ اپنی بیسٹ فرینڈ کو آٹو گراف دلوانے لے جاؤں۔ ہاؤ ایمبرینگ“ ”ہائے اتنا تو پینڈ سم ہے وہ۔ اتنی کمال

پر سنلٹی ہے اس کی، بھوری آنکھیں، لمبا قد۔ اوپر سے اتنی اچھی ایکٹنگ کرتا ہے اور.....“ ہمارے اس نے بچ میں کاٹ دی۔ ”اب اتنا بھی اچھا

نہیں ہے۔“ اس نے بمشکل جماعی روکی۔ وہ دونوں کچن ٹیبل پر آ بیٹھیں۔

”تم ہو ہی صدا کی وگئی۔ تمہیں کیا Gentleman کیا ہوتا ہے۔ تمہیں تو بس Female Artist ہی پسند آتی ہیں یا پھر 80's کے وہ کھلی سی شرٹ اور تنگ سی جینز پہنے لڑکے جو کہ اب بابے ہو چکے ہیں۔“ اس نے بھی حساب برابر کیا۔ ”خیر اب اپنی اپنی پسند کی بات ہے۔ وہ جو اب بابے ہو چکے ہیں وہ تو اصل Gentleman What a class of acting, Body language, voice quality اور سب سے بڑھ کر آواز کا اتار چڑھاؤ جو آج کل کے لڑکوں کو بالکل نہیں آتا۔ اور گلیسرین اف..... جبکہ پہلے ہلکی سی نم آنکھیں دکھا دیتے تھے اور پورے پاکستان کو رلا دیتے تھے۔“ صلہ نے ناصحانہ انداز میں اپنا تجربہ پیش کیا۔ ”ہم بیٹا کس کے ساتھ سر کھپا رہی ہو۔ یہ اپنے آگے کسی کو بولنے دیتی ہے بھلا۔ یہ چائے پیو ورنہ بحث میں ٹھنڈی ہو جائے گی۔“ امی نے گویا بات ہی ختم کر دی۔

.....☆.....

”Are they ready or not“ (شیم بادنی سٹوڈیو میں آتے ہی ایکسٹراز کی تیاری کا پوچھ رہے تھے۔ ”جی سر بس ہو گیا۔“ صلہ نے جلدی سے پیپر سنبھالے گھر کے ملازم، ڈرائیور، بلٹر وغیرہ کو وہ بڑی محنت سے ڈائلاگ تیار کروانی تھی۔ اب Lead actors تو اس کی پہنچ نہیں تھی اور نہ ان کو ورکشاپ کی ضرورت تھی۔ ان کو تو بس اس دن کا سکرپٹ دے دو۔ چند منٹ میں لائین رٹ کر کیمرہ کے آگے بول کر تو یہ جاوہ جا۔ ایک دن میں جانے کتنے سیٹ پر انہیں جانا ہوتا تھا۔ ”اوہو عبدال بھائی۔ کو نشکس مت ہوں بس ویسے ہی بولیں جیسے عام روٹین میں بولتے ہیں اور خان صاحب زیادہ اردو جھاڑنے کی ضرورت نہیں۔ اپنے پٹھانی طرز تکلم استعمال کریں۔ آپ چوکیدار ہیں کوئی فلمی ہیرو نہیں ہیں۔“ اس نے ایک ساتھ ملازم اور چوکیدار کے رول کرتے دونوں لوگوں کو جھاڑا۔ ”کیا بات کرتا ہے باجی آپ بھی۔“ خان صاحب شرما کر بولے۔

”صلہ.....“ ہما جانے کہاں سے نمودار ہوئی تھی۔ صلہ چونک گئی۔

”تم یہاں کیا کر رہی ہو؟“ پھر واپس ان کی طرف مڑی۔ ”خان صاحب یہ صفحہ پکڑیں اور پلیز اپنے انداز میں بول لے گا۔ ٹھیک ہے؟ آپ لوگ جائیں اگلا شارٹ آپکا ہے۔“ صلہ نے انہیں وہاں سے رخصت کیا۔

”صلہ یار میرے ساتھ چلو جاب انٹرویو کے لیے۔ اکیلے جاتے گھبراہٹ ہو رہی تھی۔“ ہما خاصی زور سے تھی۔

”ادفو۔ ایک تو تمہارے آئے دن انٹرویوز نے ناک میں دم کر رکھا ہے۔ اوپر سے کوئی تمہیں جاب بھی نہیں دیتا کہ کم از کم میری جان ہی چھوٹ جائے۔ کہاں جانا ہے۔“ وہ بیزار سی آگئی تھی۔

”گلبرگ میں آفس ہے۔ مجھے تو ایڈریس ٹھیک سے نہیں پتا۔ ڈھونڈنا پڑے گا۔“ وہ ڈرتی ڈرتی بولی۔ صلہ تاسف سے سر ہلا کر رہ گئی۔

”گاڑی لائی ہو؟“ وہ ہنگلے کے لاؤنج کی طرف بڑھ گئیں جہاں شوٹنگ ہو رہی تھی۔ ابھی اعفان باری اپنی لائسنز بول رہے تھے۔ ہما کی تو وہی سیٹی گم ہو گئی۔ اس سین میں ان کی بہن گھر سے بھاگ گئی تھی اور وہ غصے سے گھر کے ملازموں سے پوچھتا چھ کر رہے تھے۔ کیمرہ اب چوکیدار کو فوکس کیے ہوئے تھا۔ اعفان باری ذرا پانی کو ان دونوں کی جانب بڑھاوہ دونوں اس کی مختص کی گئی کرسی کے آگے کھڑی تھیں۔ ہما بڑے اشتیاق سے

اسے آتا دیکھ رہی تھی اور صلہ منہ کھولے خان صاحب کو۔

”ایکسیوزی۔ آنوگراف پلیز۔“ ہانے اسے قریب آتا ڈائری بڑھادی جو وہ احتیاطاً ساتھ لے آئی تھی۔ اس نے بڑی بڑی بھوری آنکھوں والی، ذرا زقد بہت ایکسائیٹڈ سی ہما کو دیکھا اور اس کی سکریپ بک پکڑ لی۔ ”صاحب مجھے نہیں پتا۔ میں تو جاگ رہا تھا اور۔“ چوکیدار صاحب مودب سے پھر اردو میں گویا تھے۔

”کٹ..... خان صاحب کیا کر رہے ہیں۔“ نسیم صاحب کی بجائے صلہ کے کٹ بولنے پر اعفان باری چونک کر مڑا۔ نسیم بادی کے ساتھ یہ اس کا پہلا پروجیکٹ تھا۔ سو وہ باقی ٹیم کے برعکس صلہ کی نسیم صاحب سے رشتے داری کے بارے میں لاعلم تھا۔ نسیم بادی نے کیمرا مین کو رکنے کا اشارہ کیا۔ اسے اپنے ذمے لگائے چھوٹے سے چھوٹے کام میں بھی کوئی کمی برداشت نہیں تھی۔ وہ یہ بات جانتے تھے۔

خان صاحب! اپنا طرز تکلم استعمال کریں اور ان کا بہن گھر سے بھاگا ہے ذرا چہرے پر مسکینیت لائیں۔“ اس نے اعفان باری کی طرف اشارہ کر کے خالص پنٹھائی ایکسیٹ میں بول کر سمجھایا۔ اعفان باری کو تاناؤ آ گیا۔ وہ تسلی سے بیٹھے ڈائریکٹر کے سکون پر حیران تھا۔ ”سفارشیں بڑی ہیں لوگوں کی۔“ اس نے تاسف سے سوچا اور میک اپ روم میں چلا گیا۔ ہما سانس روکے اسے دیکھ رہی تھی۔ اس کے جاتے ہی جیسے طلسم ٹوٹا تھا۔ وقت کا احساس ہوتے ہی وہ صلہ پر چڑھ دوڑی جواب ڈرائیور کے ساتھ سر کھپا رہی تھی۔ ”صلہ تیرا بیڑہ غرق جائے ڈیڑھ بج گئے دو بجے انٹرویو تھا۔ کب نکلیں گے اور کب پہنچیں گے۔“ ریکارڈنگ روم میں بیٹھے نسیم بادی چونکے۔ ہما مین کیمرا فریم میں کھڑی تھی اور صلہ کو کھینچتے جانے کیا کیا کہہ رہی تھی۔ ان کا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا۔ وہ بغور ہما کے چہرے کے تاثرات دیکھ رہے تھے۔

”اچھا بابا۔ پوچھ تو لینے دو انکل سے۔“ اس نے نسیم بادی کو ریکارڈنگ روم کے شیشے کے پار اشارہ کر کے اجازت چاہی۔ انہوں نے ہلکے سے سر اثبات میں ہلا دیا۔ وہ اپنا سامان لینے میک اپ روم کی طرف بڑھ گئی۔ اعفان باری نے سرسری سا اسے آتا دیکھا اور واپس اپنے سیل فون پر متوجہ ہو گیا۔ وہ اپنا بیگ پکڑتی تقریباً بھاگتی ہوئی نکلی۔ ابھی دو سین باقی تھے۔ ”زیادہ ہی سر جڑھا رکھا ہے نسیم نے اس لڑکی کو۔“ اس نے خفگی سے سوچا۔ نسیم بادی صلہ کے ابا سے عمر میں بہت چھوٹے تھے مگر ان میں دوستی بہت تھی۔ اسی لحاظ سے صلہ کے لیے وہ انکل اور وہ سب بہن بھائی ان کے لیے بچے تھے۔

.....☆.....

”تم کب سے Facebook استعمال کرنے لگیں۔“ وہ لیپ ٹاپ پر مصروف تھی جب ہما چپکے سے پیچھے آ بیٹھی۔ وہ اس کے اچانک بولنے پر ڈر گئی۔ ”تو نہیں سدھرے گی ہما۔“ ”یہ کس سے چوری چھپا chat ہو رہی ہے۔“ وہ مزے لیتی بولی۔

”ہیں یہ کیا۔“ اس نے بغور دیکھا تو وہ کوئی Celebrity Page تھا۔
 ”یہ کونسا Page جو اُن کیا ہے تم نے؟“ وہ حیران ہوئی۔

”جو اُن نہیں کیا خود بنایا ہے۔“ صلہ نے بتایا اور Page scroll up کیا۔ Page کے اوپر بڑا سا Zarina khar official لکھا تھا۔ ہمارا حیران ہوئی۔ ”ضرورتاً Hack کیا ہوگا۔ اتنی ساری activities تمہارے پاس اتنا وقت کہاں سے آیا۔“
 ”تم وہ چھوڑو یہ دیکھو۔“ اس نے Page پر موجود ویڈیو پلے کی۔ جس میں زرینہ خان کے مختلف ڈراموں کے اس طرح سین کاٹ کر ملائے گئے تھے کہ الگ کہانی بن گئی تھی اور پس پردہ موسیقی کے لیے انہی کے معروف ڈرامے کا خوبصورت سائٹل سونگ اور میوزک تھا۔ ہمارا بھی دیکھ کر لطف اندوز ہوئی۔ اس نے خود سے دوسری ویڈیو بھی لگا کر دیکھی۔ جس میں ان کی بچپن سے اب تک کی تمام آن سکرین اور آف سکرین نایاب تصویریں مختلف انداز میں ملا کر تیج بنایا گیا تھا۔ ان کی پریزنٹیشن اور بیک گراؤنڈ کمال تھا۔

”یہ بچپن میں کتنی کیوٹ ہیں اور ابھی تک ویسے ہی لگتی ہیں معصوم سی۔“ ہمارا خاصی متاثر تھی۔ ”تمہیں پتا ہے سلبرٹی تیج کی مشہوری کرنے پڑتی ہے اور اس شخصیت کے ساتھ ذاتی تعلق ہونا ضروری ہوتا ہے ورنہ Page میں جان نہیں پڑتی۔ پردہ تو میرا ہے نہیں۔ لیکن پندرہ ڈالر کی مشہوری میں نے خوب لی ہے۔ تبھی تو اتنی following ہے اس تیج کی۔“

”مگر تمہیں کیا مصیبت پڑی تھی اتنا نام اور پیسہ ضائع کرنے کی۔“ ہمارے دوسری سرگرمیاں بھی چیک کیں۔ سب ہی دلچسپ تھیں۔
 ”یار تیج پوچھو تو شوقیہ یہ Page ڈیزائن کیا تھا۔ تب میں نے دیکھا کہ ان کے نام سے اور بھی لوگوں نے اکاؤنٹ بنا رکھے ہیں مگر ان کے کام کو کسی نے بھی اچھے طریقے سے پیش نہیں کیا۔ چونکہ خاصی نیچرل اداکاری ہے ان کی سو میں انہی کے ڈراموں سے ان کے مختلف منظر نامے لے کر الگ کہانی بن لیتی تھی اور وہ منظر نامے ایسے فٹ بیٹھے جیسے انگوٹھی میں نگینہ۔ اور تمہیں تو پتا ہی ہے مجھے کہانی بننے کا کتنا شوق ہے۔“ صلہ لاگ آؤٹ کرتی بولی۔

”لیکن تمہارے ان کے بارے میں بنائے کوڑ اور بحث و مباحثہ کے ٹاپکس پر کوئی متاثرہ بات ہوگئی تو؟ اوپر سے تم نے Page کے ماتھے پر اتنا بڑا جھوٹ لکھا ہوا ہے کہ یہ ان کا واحد آفیشل تیج ہے جسکے توسط سے انکے پرستاران سے رابطہ کر سکتے ہیں۔ انہوں نے اگر خود یہ Page وزٹ کر لیا اور کوئی گزب ہوگئی تو تمہیں Sue بھی کیا جاسکتا ہے۔“ ہمارے ایک ہی سانس میں حقیقت بتائی اس کے بولنے کے ساتھ صلہ کے بدلتے تاثرات یکدم ڈھیلے پڑ گئے۔

”بھئی میں کونسا ان کے ذاتی زندگی کو جانتی ہوں۔ آن سکرین لائف اور ان کے کیریئر گراف پر ہی ہلکی پھلکی تبصرے ہوتے ہیں۔ تمہیں علم نہیں اس بندی نے اپنے دور میں شہرت کی وہ بلندی دیکھی ہے جو آجل کے ٹاپ ایکٹرز کو نہیں ملی۔ خاص طور پر فیمیل آرٹسٹ کو۔ پھر اچانک ایسا کیا ہو گیا کہ انہوں نے اداکاری کو خیر باد کہہ دیا۔ گیارہ سال سے وہ اداکاری نہیں کر رہیں۔ کبھی کبھار ہدایتکاری کرتی رہی تھیں۔ کسی انٹرویو میں انہوں نے اس کا جواب نہیں دیا۔ حیرت کی بات ہے۔“ اس نے پرسوج انداز میں کہا پھر یکدم ہلکی پھلکی ہو کر ہمارے پاس بیڈ پر بیٹھ گئی۔ ”نہیں ملی ان سے تو کیا ہوا۔ اسی کے توسط سے مل لوں گی۔“ اس کے لہجے میں شرارت تھی سو chill مارو۔“ اس نے گویا ناک سے مکھی اڑائی۔

”اچھا ٹھیک ہے۔ سانون کی۔“ ہمانے بھی بے نیازی سے کاندھے اچکائے۔ ”ہاں میں تم سے پوچھنے آئی تھی کہ انکل نے ابو سے بات کی تھی یا نہیں۔“ وہ یکدم روہانسی ہو گئی ساری بشارت چٹکیوں میں غائب ہو گئی۔ والد محترم لڑکیوں کے شو بزنس میں جانے کے سخت خلاف تھے۔

”کس بارے میں۔“ صلہ کہنی کے بل دراز تھی۔ جان بوجھ کر انجان بنی پوچھ رہی تھی۔

”شوخی، تمہیں پتا ہے کس بارے میں۔“ ہمانے اسے آنکھیں دکھائیں۔

”لومیزڈم شرما ایسے رہی ہیں جیسے کسی لونڈے کے بارے میں پوچھنا ہے۔“ اس نے دادو کی طرح لڑکے کی بجائے لونڈے کا لفظ استعمال کیا۔ پھر اس کے غصیلے تاثرات جانچتے ہتے ہوئے بولی۔ ”ارے فکر نوٹ۔ ابا نے کہا ہے کہ بس مان جائیں گے تھوڑا صبر کر لو۔ وہ اور نسیم انکل مل کر تمہارے ابو کی برین واشنگ کر رہے ہیں۔“ وہ تسلی سے بولی۔

”ہائے قسم جب نسیم انکل نے اوڈیشن کے لیے بلایا تو میرا خوشی وحیرت کے مارے۔“ ہما کی بات ادھوری رہ گئی۔

”ہاں سہی نکل گیا۔“ صلہ نے لقمہ دیا تو اس نے کشن اٹھا کر اسے دے مارا۔

”جی نہیں وہ تمہارا نکلا ہو گا جیسی کے مارے۔ میرا تو دم ہی نکل گیا تھا۔“ اس نے چڑایا۔

”جی بالکل۔“ صلہ نے مسکھک اڑانے والے انداز میں زور زور سے سر ہلایا۔

”ویسے اگر تم مجھے اوڈیشن کے لیے تیاری نہ کروا تیں تو یہ ہیروئن بننے کا چانس تو جاتا ہی۔ ساتھ میں یہ وطن عزیز اتنی Talented اور خوب صورت اداکارہ سے محروم رہ جاتا۔ ویسے یہ اب بھی ہو سکتا اگر ابو نہ مانے تو۔“ وہ جو اپنے وقت کی اداکارہ جیسے پوز کرتی بول رہی تھی یکدم منہ بسور کر بیٹھ گئی۔ ”ڈونٹ وری بچہ۔ نسیم انکل اور ان کے کام کرنے کے طریقے سے وہ بھی اچھی طرح واقف ہیں۔ انہوں نے کئی نئے چہرے متعارف کروائے ہیں۔ مان جائیں گے ویسے بھی انکل کا نیا پروجیکٹ اگلے مہینے شروع ہو رہا ہے۔ بہت ٹائم ہے ابھی“ اس نے ہما کو تسلی دی۔

☆.....

سینس پر عجب انفر اتفری کا عالم تھا۔ آج اس پروجیکٹ کے ختم ہونے کا Second last دن تھا۔ آخری منظر ناموں کی تیاری چل رہی تھی۔ اعغان باری جو کہ مرکزی کردار ادا کر رہے تھے اپنا کام ختم کروا کر کب کے جا چکے تھے۔ اس کے مقابل کردار بالاج علی شاہ میک اپ روم میں بیٹھا آج کا سکرپٹ پڑھ رہا تھا۔ بالآخر شوٹنگ شروع ہوئی۔

”یار کیا بکواس ہے۔“ بالاج اپنی لائنز بولتے بولتے سپاٹ بوائے پر چیخا تھا۔ اس کا اشارہ سامنے والی لائٹس پر تھا۔ جو غالباً اس کی آنکھوں میں پڑ رہی تھی۔ سپاٹ بوائے کا رنگ اڑ گیا اس کے غصے سے سبھی ڈرتے تھے۔ وہ سامنے والے کوٹیش میں تھپڑ تک مار دینے کا عادی تھا۔ یہ چوتھی دفعہ وہ لائنز بھولا تھا۔ ایسا کبھی عموماً ہوتا نہیں تھا کہ وہ اپنی لائنز بھولے۔ وہ پہلے بھی نسیم بادی کی ساتھ کام کر چکا تھا۔

”گلتا ہے بیوی سے لڑ کر آیا ہے۔“ صلہ نے عادتا خود کلامی کی جوا کثر خود کلامی کم سرگوشی زیادہ ہوتی تھی۔ وہ کیمرا مین مسعود کے بائیں جانب کھڑی تھی۔

”بیوی تو نہیں ہے ان البتہ بچے ضرور ہیں۔“ مسعود اس کی سرگوشی سے محفوظ ہوتا بولا۔

”کیا مطلب۔“ وہ حیران ہوئی۔ ”مطلب تو پتا نہیں۔ بس اڑتی اڑتی خبر سنی ہے کہ موصوف کے دو عدد بچے ہیں۔ بڑی بیٹی سات سال کی

اور بیٹا 4 سال کا۔“

”کیا پتہ غلط خبر ہو۔ یا پھر بیوی بھاگ گئی ہو۔“ صلہ نے ہنستے ہوئے تبصرہ کیا۔ سپاٹ بوائے پر چلانے کے بعد وہ اپنی سیٹ پر جا بیٹھا اور سکرپٹ تھام لیا۔ اس کے چہرے سے بے چینی و پریشانی واضح تھی۔

”جی مسٹر شاہ شروع کریں۔“ صلہ نے صبر آزماتا انتظار کے بعد بالآخر کہا تو سردی نگاہ اس پر ڈال کر وہ دوبارہ سکرپٹ پر دیکھنے لگا۔ صلہ کو غصہ تو بہت آیا مگر وہ اعفان باری تو تھا نہیں جسے وہ دبدو جواب دیتی تھی۔

یہ اتفاق تھا یا قسمت کہ ان دو سالوں میں وہ نسیم بادی کی ہر پروجیکٹ میں تقریباً شامل ہوتا تھا۔ اور کام کے سلسلے میں ہوئی گفتگو بھی اس کے لیے کم از کم خوشگوار نہیں رہی تھی۔ صلہ کے لیے اس سے محض بات کرنے کا ہی تجربہ بڑا ناخوشگوار رہا تھا۔ وہ حتی المقدور بالاج علی شاہ سے احتراز برتی تھی۔

مگر آج نسیم بادی کو ایمر جنسی میں جانا پڑ گیا تھا۔ وہ باقی ماندہ کام صلہ پر چھوڑ کر گئے تھے۔ دونوں تجربہ کار اداکاروں کے سین فلم بند کرنے رہ گئے تھے اس میں زیادہ وقت بھی نہیں لگنا تھا مگر وائے قسمت آج بالاج علی شاہ کا موڈ سخت خراب تھا۔ چند لمحے بعد وہ قدرے کمپوزڈ ہو کر آیا اور چھٹے ٹیک میں بالآخر ان کا سین ہو گیا۔ صلہ نے سکھ کا سانس لیا۔

کام سمیٹتے پیک اپ کرواتے کرواتے آٹھ بج گئے۔ اس نے سوچا تھا آج نسیم بادی کے ساتھ چلی جائے گی۔ مگر ابا اور نسیم انکل کے کامن دوست آذر کو ہارٹ اٹیک ہوا تھا۔ وہ دونوں ہسپتال گئے تھے۔

میک اپ روم میں سامان چیک کرتے اس کی کوفت میں مزید اضافہ ہو گیا۔ اپنا بیگ اور فائل چیک کرتے وہ سخت جھنجھلا گئی۔

”ناٹ اگین۔“ آج بیگ سے موبائل اور والٹ دونوں غائب تھے۔ کام کے دوران اُسے اپنے سامان کی کوئی ہوش نہیں ہوتی تھی۔ وہ وہیں سر تھام کر بیٹھ گئی۔ چند لمحے خالی اندہنی کی سی کیفیت میں گزر گئے۔ اسے تو کسی کا نمبر بھی یاد نہیں تھا۔ ابا بھی ہاسپٹل تھے گھر فون کرنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ ہما کا نمبر بھی ذہن میں نہ آیا۔ وہ الجھ گئی۔

☆-----

جیجی اسے کامن روم میں بالاج علی شاہ کے ہونے کا احساس ہوا۔ وہ ابھی تک بے تاثر چہرے لیے فائل لیے بیٹھا تھا۔ صاف پتا چلتا تھا کہ وہ فائل پر متوجہ نہیں تھا۔ سٹوڈیو خالی ہو چکا تھا۔ وہ وہیں بیٹھا تھا۔

”ایکسیکو زمی مسٹر شاہ۔“ اس نے ڈرتے ڈرتے اسے مخاطب کیا تو وہ چونک سا گیا۔ اس کی نگاہوں میں اجنبیت تھی گویا روم میں اس کی موجودگی سے بے خبر تھا۔

”آپ کے پاس نسیم انکل کا فون نمبر ہوگا؟“ وہ چند لمحے جیسا پہچاننے کی کوشش کرتا رہا۔ پھر قدرے بیزار سے جان چھڑوانے والے انداز میں اپنا سمارٹ فون اس کی طرف بڑھا دیا۔ اس نے جلدی سے نمبر ڈھونڈ کر ملایا۔ اس نے واپس اپنی منقطع سوچوں کا سلسلہ وہیں سے جوڑ لیا۔ صلہ کان سے فون لگائے قدرے فاصلے پر آگئی کہ کہیں ہوش میں آکر وہ سیل فون واپس ہی نہ چھین لیے۔ بالاج علی شاہ سے کوئی بعید بھی نہ تھی۔ ”ہیلو انکل۔ میں صلہ۔“ انکل وہ میرا والٹ اور موبائل چوری ہو گیا ہے۔ سب چلے گئے ہیں میں کیا کرو۔“ اس نے جلدی جلدی مدعا بیان کیا۔

”صلہ کب سدھرو گی تم پہلے بھی دو دفعہ ہاتھ ہو چکا ہے تمہارے ساتھ مجال ہے جو تم ذرا اپنے سامان کا خیال کرلو۔“ انہوں نے ڈانٹا۔

”اچھا اب ہو گیا نہ۔ اب کیا ہو سکتا ہے۔ آپ مجھے لینے آجائیں۔“

”بچے۔ تمہیں پتا تو ہے آذر کو ہارٹ اٹیک ہوا ہے اور ہم دونوں کے علاوہ کوئی نہیں اسکا۔ جو دو عدد بیٹے ہیں دونوں ملک سے باہر ہیں۔ میں کہاں آ سکتا ہوں تمہارے ابا بھی ابھی تک آفس سے نہیں نکل پائے۔“ وہ رو کے۔ ”اچھا یہ تم نے شاہو کے نمبر سے کال کی ہے۔ وہ ادھر ہی ہے؟“ انہوں نے اس کا لقب العام لیا۔ ”جی سر۔“

”اسی کے ساتھ آجاؤ نا۔ بلکہ تم فون دوا سے میں اسے ایڈریس سمجھاتا ہوں۔“ ”کیا۔“ وہ دبی دبی آواز میں چیخی۔ ”بالکل نہیں۔ مجھے زندہ سلامت گھر پہنچنا ہے انکل۔“ اس نے بمشکل تھوک نگلا۔ وہ ہنوز بنا پلک جھپکے فائل پر نظریں جمائے بیٹھا تھا جیسے اس کے مسئلے کا حل کو دیکھ رہا ہو۔

”آج اچھا۔“ نسیم صاحب کی ڈانٹ کھانے کے بعد اس نے سیل اس کی جانب بڑھایا وہ ناگہی کے عالم میں اسے تکتے لگا۔ ”نسیم انکل آپ سے بات کرنا چاہ رہے ہیں۔“ وہ انکی۔

”اس نے بے توجہی سے فون کان سے لگا لیا۔ وہ چند لمحے بیزار سے سنتا رہا۔ ”سر میرے پاس اتنا فالتو نام نہیں ہے۔ آپ کسی اور سے کہہ دیں گے۔“ وہ قطعیت سے بولا تھا۔ کشادہ پیشانی پر ڈھیروں بل پڑ گئے۔ صلہ کار کا سانس بحال ہوا۔ وہ خود اس کے ساتھ جانا نہیں چاہتی تھی۔ وہ کوئی اور طریقہ سوچنے لگی۔ ”لیکن سر۔“ وہ رکا۔ لب بھینچے وہ دوسری طرف نسیم صاحب کو من رہا تھا۔ اب کے ڈانٹ کھانے کی باری اس کی تھی۔

ماڈلنگ کی دنیا میں سکھ جانے کے بعد اب ڈرامہ انڈسٹری میں مضبوط قدم جما چکا تھا۔ اور اس ٹیلنٹ کو نکھارنے میں نسیم باونی کا بڑا ہاتھ تھا۔ جن چند لوگوں کی انڈسٹری میں وہ عزت کرتا تھا نسیم باونی ان میں سے ایک تھے۔

”جی ٹھیک ہے۔“ آخر اسے مانتے ہی بنی۔ وہ ایک جھٹکے سے اٹھا تھا۔ صلہ متحیر سی اسے دیکھتی رہ گئی۔ کوٹ کا بٹن بند کرتا وہ دروازے کی جانب بڑھ گیا۔ وہ بے بس سی سوچ کر رہ گئی۔ آج واقعی اس کا دن خراب تھا۔ دل ہی دل میں جھنجھلاتی وہ پارکنگ کی جانب لپکی۔

☆.....

چہرے پر تنہائی بے زاری سجائے وہ گاڑی سٹارٹ کیے بیٹھا تھا۔ اسکو دیکھتے ہی اس کے اوسان خطا ہونے لگے۔ جی کڑا کر کے وہ فرنٹ سیٹ پر براجمان ہو گئی۔ اس کے بیٹھے ہی اس نے ایک جھٹکے سے گاڑی آگے بڑھائی ریش ڈرائیونگ کرتا پوش ایریا سے مین روڈ پر گاڑی ڈال دی۔ وہ اب قدرے ریلیکسڈ بیٹھی باہر کے نظاروں میں گم تھی۔ سڑک کے کنارے گول گپے کی ریڑھی کے پاس سے گزرتے وہ یکدم خوشی سے چلائی تھی۔

”ہائے گول گپے۔“ اس کے چہرے پر بچوں کی سی ایکساٹمنٹ تھی۔ اس ایکساٹمنٹ میں بھول ہی گئی کہ نسیم انگل کے ساتھ نہیں بلکہ بالاج علی شاہ کے ساتھ بیٹھی تھی۔ بالاج کا پاؤں بے اختیار بریک پر جا پڑا تھا۔ اس اچانک افتاد پر اس نے گڑبڑا کر اسے دیکھا تھا۔ گاڑی جھٹکے سے رکی اور وہ ونڈ سکرین سے زور سے نکل رکی تھی۔ ”اف مرگئی۔ دھیان سے نہیں چلا سکتے؟ وہ اپنے ازلی لا پرواہ انداز میں بولی تھی۔ بالاج تپ کر رہ گیا۔ وہ اسے سخت ست سنانے والا تھا کہ اس کا فون بج اٹھا۔ دل ہی دل میں اسے برا بھلا کہتا اس نے فون نکالا۔ بڑے دنوں سے گول گپوں کی صورت نہیں دیکھی تھی اور ابابا کو بھی لانے یا نہیں رہتے تھے۔ سو اس اندوہناک کمی کی ادراک اچانک ہوا اور ایسا احساس ہوا کہ بھول گئی کہ کس کے ساتھ گاڑی میں بیٹھی ہے۔ سکرین پر نمبر دیکھتے اس کا موڈ اور خراب ہو گیا۔

”اب کیا تکلیف ہیں تمہیں۔“ بغیر سلام دعا وہ غصے سے بولا تھا۔ صلہ ماتھا سہلاتی اس کی جانب متوجہ تھی۔ وہ عین سڑک کے درمیان گاڑی روکے کھڑا تھا۔ بے تحاشا ہارن کی آوازیں تھیں۔ اس نے گاڑی سٹارٹ کی اور قریبی کٹ سے یوٹرن لے لیا۔

”کیا کر لوگی تم ہاں؟“ وہ بہت ضبط کیے اس خاتون کی بات سن رہا تھا۔ صلہ ماتھا سہلاتی اس کی آواز کی طرف متوجہ تھی۔ گاڑی میں دبیز خاموشی کی وجہ سے لڑکی کی چنگھاڑتی آواز سنائی دے رہی تھی۔

”اوشٹ اپ.....“ وہ درشتی سے بولا مگر دوسری جانب سے بھی تابڑ توڑ حملے ہو رہے تھے۔

”جسٹ گوٹو Hello بولڈی بچ۔“ اس کے بعد اس نے پے در پے انگریزی کی موٹی موٹی گالیاں دیں اور فون ڈیش بورڈ پر پٹخ دیا۔ اس لڑکی نے جانے کیا کہا تھا کہ اس قدر بھڑک اٹھا۔ اس کی خالص زنانہ قسم کی گالیاں سن کر صلہ بے ساختہ شرمندہ سی دروازے سے چپکی بیٹھی تھی۔ اس کا چہرہ لال بھسوکا ہو رہا تھا۔ وہ قدرے شاکٹ کٹ راستہ تھا جو چھوٹی چھوٹی گلیوں سے ہوتا رنگ روڈ کو نکلتا تھا۔ اس رہائشی ایریا کے جا بجا سپیڈ بریکرز کی وجہ سے سپیڈ تھوڑی کم ہوتی تھی۔ ورنہ جگ گلیوں میں بھی اس نے خطرناک رفتار کم نہیں کی تھی۔ وہ ہینڈل تھا مے دل ہی دل میں آیت الکرسی اور جو سورتیں زبانی یاد تھیں پڑھ رہی تھی اور مسلسل اس وقت کو کوس رہی جب اس منحوس گاڑی میں بیٹھی تھی۔

خدا خدا کر کے گھر آیا۔ وہ ایک سیکنڈ کی بھی تاخیر کیے گاڑی سے اتری مبادا وہ خود دھکا ہی نہ دے دے۔ اس کے اترتے ہی وہ زن سے گاڑی بھگالے گیا۔ اس نے انکی ہوئی طویل سانس خارج کی۔ خود کو نارمل کرتے اندر کی جانب بڑھ گئی۔

☆.....

بالاج علی شاہ کے بچوں کی کسٹڈی کا کیس چل رہا تھا۔ اس کی بدنام زمانہ شہرت کے باعث اس کا پلڑا بہت ہلکا تھا۔ مگر وہ کسی صورت بچوں کو ان کی ماں کے حوالے کرنے کو تیار نہیں تھا۔ ان کی علیحدگی کو ایک عرصہ گزر گیا تھا اور اتنے سالوں بعد اسے بچوں کی یاد کیوں ستا رہی تھی وہ اچھی طرح جانتا تھا۔ سیٹ پر وہ کل سے بھی زیادہ مضحمل اور پریشان تھا مگر آج نسیم بادیانی اس کے خڑے اٹھانے کو موجود تھے۔ وہ ان کا چہیتا بھی تو بہت تھا۔

”ہاں صلہ ٹھیک سے گھر پہنچ گئیں تمہیں کل؟“ اسے کوئی کام کہتے نسیم بادیانی کو اچانک یاد آیا تھا۔ ”جی سر۔“ اس نے بری سی شکل بنائی۔ ہاتھ بے اختیار ماتھے پر بنے قدرے ابھرے گھامڑ پر گیا تھا۔

وہ لاؤنج میں تنہا بیٹھا تھا کہ اسی اثناء سینئر اداکارہ عارفہ ابرار کا وہاں سے گزر ہوا۔ وہ اس کے برابر صوفے پر آ بیٹھیں۔ ”کیسے ہوشا ہو۔ آج تم غضب ڈھا رہے ہو بھی۔ کلر سلیکشن تو تمہاری ہمیشہ سے اچھی رہی ہے۔“ وہ اپنے مخصوص انداز میں اک ادا سے بولیں۔ ایک نگاہ غلط ان پر ڈال کر واپس اپنے فون پر گیگ کھیلنے میں مصروف ہو گیا۔

”بھئی میں نے تو سنا ہے کہ یہ ڈرامہ تو صرف تمہاری وجہ سے چل رہا ہے وہ عفتان باری تو نام کا ہیرو ہے بس۔“ وہ ہال پیچھے کرتی بولیں۔ شاہوکی اعفتان سے بالکل بھی نہیں بنتی تھی۔ یہ بات سارا زمانہ جانتا تھا۔ اس کھیل کی سترہ اقساط نجی چینل کو دی جا چکی تھیں۔ اور وہ آج کل آن ایر تھا۔ کلائیکس پر حتمی کام بھی جاری تھا۔ وہ بد مزہ ہوا تھا۔ ان سے ایکسیو ز کرتا لاؤنج سے باہر آ گیا۔ ڈاننگ ہال میں اگلے سین کی تیاری چل رہی تھی۔ اس نے سگریٹ نکال کر لبوں سے لگا لیا اور جیبیں ٹٹولنے لگا۔ لائٹر شاد اندر لاؤنج کے صوفے پر بھول آیا تھا۔ وہ دوبارہ ان خاتون کے منہ نہیں لگنا چاہتا تھا۔ سو اس سے متصل بڑے سے ڈاننگ ہال میں کمرہ پر مصروف مسعود کے پاس چلا آیا۔ ”لائٹر ہوگا تمہارے پاس۔“ اس کے استفسار پر مسعود نے نفی میں سر ہلایا۔ ”تنویر سے کہیں وہ لا دے گا۔“ مصروف سے انداز میں بولا۔

تنویر کہیں آس پاس نظر نہیں آتا تو کچھ سوچ کر وہ اس طرف چلا آیا جہاں لمبے بالوں کی اونچی پونی ٹیل ہلاتے وہ سپاٹ بوائے کو ہاتھ کے اشاروں سے ہدایات دینے میں مصروف تھی۔ وہ اس کے عقب میں آکھڑا ہوا ”لائٹر یا ماچس ہوگی تمہارے پاس۔“ اس کے گھمبیر لہجے میں کیے گئے استفسار پر صلہ کا دماغ گھوم گیا۔ وہ تیزی سے مڑی تھی۔ ”میں کیا آپ کو سکریٹ پیٹی نظر آ رہی ہوں؟“ وہ غصے سے بولی تھی۔ وہ جو سپاٹ بوائے سے مخاطب تھا اس کے بولنے پر گڑ بڑا گیا۔ اس نے دانت نکوستے ماچس نکال کر اسے دی۔ وہ صلہ کو لچکائی نظروں سے دیکھتا ماچس لینے چلا گیا۔ صلہ پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔

”تو بھی بوگی ہے صلہ۔“ اس نے ماتھا پیٹتے خود کلامی کی۔ سپاٹ بوائے طارق کے دانت کچھ اور نکل آئے۔ ”تم کیا دانت نکال رہے ہو کام کرو اپنا۔“ اس نے خجالت چھپانے کو غصے کا سہارا لیا۔

وہ کنٹرول روم میں آ بیٹھا جہاں نسیم بادی کل کی ریکارڈنگ دیکھ رہے تھے۔ تمام شارٹس حسب معمول تھے۔ مگر ایک شارٹ پر رُک گئے۔ وہاں ہمیشہ کی طرح صلہ نے ڈنڈی ماری تھی۔ وہ لانگ شارٹ لینے کا کہہ گئے تھے مگر اس نے شاہو کا کلوز اپ لیا تھا۔ ”اس لڑکی کو موقع چاہیے اپنی سن مانی کرنے کا۔ یہ شارٹ دوبارہ لیں گے۔“ انہوں نے مسعود کو کہا جو ابھی اندر آیا تھا۔

”کیوں کیا ہو اس شارٹ کو ٹھیک تو ہے۔“ بالاج جو خاموشی سے ان کی بڑبڑاٹیں سن رہا تھا سنجیدگی سے بولا۔

”مگر یہ لانگ شارٹ میں اچھا لگنا تھا۔ اتنی مہنگی سیٹ ڈیزائننگ بھی تو دکھاتی ہے۔ اب پروڈیوسر بولے گا۔“ وہ چڑ سے گئے۔ کام تھا کہ بڑھتا جا رہا تھا۔

”میرے خیال میں اتنا برا بھی نہیں ہے اور پلیز ابھی میں دوبارہ نہیں کرنے والا یہ سین۔“ وہ جھنجھلا یا تھا۔

ہائے صلہ تم آگئی۔ اف خدایا آج تک کسی کا اتنی سچے دل سے انتظار نہیں کیا جتنا آج تیرا کیا ہے جان من۔“ ہما اس کے آتے ہی ترنگ میں بولی۔ وہ جھکی ہاری 9 بجے پہنچی تھی اور ہمارندھاوا پہلے سے موجود تھیں۔ رندھاوا نام نسیم بادی نے چنا تھا۔ تاکہ نام میں وزن لگے۔ وہ بیگ بھینکتی وہیں صوفے پر ڈھیر ہو گئی۔ ”ند سلام نہ دعا۔ ایسی ہی گھر میں داخل ہو گئی۔ دیکھ رہی ہو بہو تمہارے بچے تو تیز و تہذیب سے بالاتر ہوتے جا رہے ہیں۔“ قریب بیٹھی اردو ادب کی شوقین دادو نے بہو کو تنبیہ کرنا ضروری سمجھا۔

”ہائے دادو آج کیا اردو ادب کا کوئی پروگرام ملاحظہ فرمایا تھا جو اتنی شستہ اردو میں فرمان جاری کر رہی ہیں۔“ صلہ سے اپنی ٹھیکہ پنجابی سیمینگ دادو کی اردو ہضم نہ ہوئی۔

”اٹھو صلہ۔ شاباش فریش ہو کر آؤ۔ تمہارے ابا آنے والے ہیں۔ کھانے میں میری ہیلپ کرو آؤ آکر۔“ امی نے بحث سے بچنے کو اسے منظر سے غائب کرنا چاہا۔ وہ بحث کرنے میں اپنی دادو پر پڑی تھی۔ دونوں شروع ہوتے تو چپ ہونے کا نام نہیں لیتے تھے۔ دادو بھی Qtv کی نشریات میں مگن تھیں تو کچھ نہ بولیں۔ وہ کچن میں چلی آئی تو ہما بھی اس کے پیچھے چلی آئی۔

”اف لڑکی پھوٹ بھی چکومند سے اب۔ پیٹ میں شدید درد ہو رہا ہوگا تمہارے۔“ سلاد کے لیے سبڑیاں نکالتے صلہ نے اسے کہا۔

”ہائے شیلہ کیا بتاؤں تجھے..... اس نے حسب معمول نام بگاڑا۔ نسیم انکل کا فون آیا تھا۔ دونوں انکل حضرات نے مل کر ابا کو منالیا ہے اور انہوں نے کل مجھے کنٹریکٹ سائن کرنے بلایا ہے۔ پروڈیوسرز کے ساتھ۔“ وہ بہت خوش نظر آرہی تھی۔ صلہ نے ایک نظر اس پر ڈالی۔

”سکرپٹ پڑھا ہے تم نے؟“ کھیرا کانٹے اس نے سنجیدگی سے پوچھا تھا۔ ”وہ تو کل ملے گا نا۔ ویسے انہوں نے مجھے بتایا ہے کہ تین لڑکیوں کی کہانی ہے۔“ انعم قریشی اور زارا حیات کے ساتھ میرا debut ہوگا۔ آئم سوا یکسا یٹنڈ۔ اس نے ایک اور ٹکڑا اٹھا کر منہ میں ڈالا۔

”وہ تو ٹھیک ہے لیکن پوری کہانی پڑھ کر ہی سائن کرنا۔ پہلا تاثر اچھا ہونا چاہیے ورنہ لوگ آپکا کیا پہلا برا کام نہیں بھولتے۔“ اس نے اس سے چھری لے لی کہ وہ کاٹ کم اور کھا زیادہ رہی تھی۔ ایکسا ٹمنٹ میں وہ دبا کر کھاتی تھی۔

”تم چلنا نا میرے ساتھ..... کہانی غور سے پڑھ لینا اور کنٹریکٹ بھی اور مجھے بتا دینا وہ سلاد کا پتہ کترتی لا پرووائی سے بولی۔

”ایکٹنگ بھی میں ہی نہ کر لوں۔“ صلہ نے چڑ کر سلاد کی پلیٹ اس کی پہنچ سے دور کی کہ ٹیبل پر جانے سے پہلے اس کے ختم ہونے کے امکانات بہت روشن تھے۔ بڑی کمینی ہو تم۔“ وہ پلیٹ دور کرنے کی گستاخی پر بلبل اٹھی۔

”ارے یاد آیا۔ میں کل تمہارے ساتھ نہیں جاسکتی۔ ایک جگہ انٹرویو دینے جانا ہے۔“ وہ ٹیبل پر برتن رکھتے بولی۔

”کیا؟“ ہما زور سے چلائی تھی۔ صلہ نے اسے والیوم کم کرنے کا اشارہ کیا۔ ”تم اب نسیم انکل کے ساتھ کام نہیں کرو گی؟ وہ قدرے ہلکا بولی مگر چہرے پر زلزلے کے تاثرات ختم نہ ہوئے۔ ابا نے صرف نسیم انکل کے ساتھ بطور اسٹنٹ کام کرنے کی اجازت دی تھی۔ ورنہ وہ اس خواری والی جاب کے سخت خلاف تھے۔

”کروں گی۔ لیکن یہ والا پروجیکٹ نہیں۔ کل جہاں جانا ہے وہاں آزادی بہت ہے۔ کیونکہ ہدایتکار صاحب تو زیادہ تر ہدایات دے کر کئی

کئی دن شکل نہیں دکھاتے۔ سب کچھ میرے کنٹرول میں ہوگا۔ اپنی مرضی چلاؤں گی۔“ صلہ مزے لیتی بولی۔

”بہت بری ہوتی صلہ۔ عین وقت پر دھوکہ دے کر جا رہی ہو۔“ اس کے لہجے میں بے پناہ مایوسی تھی۔ سارا جوش جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔

”ارے تم فکر کیوں کرتی ہو۔ نسیم اٹکل ہیں ناں۔ وہ ہر نیو کمر کو بہت محنت سے تیاری کرواتے ہیں۔ مجھے اس پروجیکٹ کا بہت عرصے سے

انتظار تھا۔ کیونکہ پروڈکشن ہاؤس کے مالک کا بھائی ڈائریکٹر ہے اسی لیے تو موجیں مارتا ہے۔“ وہ اب رسائیت سے اسے سمجھانے بیٹھ گئی ابھی پورا

گھنٹہ اسے منانے میں صرف ہونا تھا۔ اس سے سات سال چھوٹی اس کی جڑواں بہنیں کشف اور رائیل بھی وہیں لاؤنج میں برا سامنہ بنائے بیٹھی تھیں

کیونکہ ریموٹ پر دادو کا قبضہ تھا۔ وہ دونوں روز کی طرح دادی کے اپنے کمرے میں جانے کی دعا کر رہی تھیں مگر حسب معمول ان کے جانے سے پہلے

ہی ان کا نیند سے برا حال ہو رہا تھا۔ وہ بمشکل آنکھیں کھولے بیٹھی تھیں۔ ابا بھی تک نہیں آئے تھے۔ انہوں نے لیٹ آنے کی اطلاع دی تھی۔ سب

کھانا کھا کر اپنے اپنے کمروں میں جا چکے تھے۔ لیکن اسے ابھی ابا کا انتظار کرنا تھا۔ وہ آفس سے اپنے دوست آذر کی عیادت کو گئے تھے۔ جو ابھی تک

ہسپتال میں تھے۔ ہا بھی کھانا کھا کر جا چکی تھی۔ ڈائمنگ ٹیبل کی کرسی کی پشت سے ٹیک لگائے اس نے بے مقصد فون ملایا۔ دوسری Bell پر بڑے

مصروف سے انداز میں ہیلو کہا گیا۔

”جی ابا حضور۔ آپ کی تشریف آوری کب تک ہوگی۔“ وہ حسب معمول بٹاش لہجے میں بولی۔ ”بس راستے میں ہوں۔ یہ گاڑی بھی بیچ

رستے میں دغا دے جاتی ہے۔“ وہ بہت تھکے تھکے لگ رہے تھے۔ ”او کے ہم آپ کی راہوں میں کھانا سجائے آپ کی راہ تک رہے ہیں۔ جلدی سے آ

جائیں۔“ وہ شرارت سے بولی۔ جو ابا وہ نڈھال سی ہنسی بنے اور خدا حافظ کہتے فون رکھ دیا۔ وہ اداس سی ہو گئی۔ اسے ہمیشہ حسرت ہی رہی کہ کبھی ابا

پرانے والے ابا بن جائیں۔ اس کے شرارتی انداز میں کہے ابا حضور کا جواب پہلے کی طرح پیاری دختر نیک اختر کہہ کر دیں۔ مگر شیر کی جانے کے

بعد ابا بالکل بدل گئے تھے۔



چند سال پہلے رحمان اکبر کا گھر ایسا نہیں تھا جیسے اب تھا۔ انکا بڑا بیٹا شرجیل رحمان اس وقت انٹر کر کے فارغ ہوا تھا جب اس پر امریکہ

جانے کا بھوت سوار ہوا تھا۔ رحمان صاحب نے ہر باپ کی طرح بچوں سے متعلق بہت سے خواب سجا رکھے تھے۔ شرجیل کو وہ ایروینڈ شکل انجنئر اور

صلہ کو ڈاکٹر بنانا چاہتے تھے۔ رائیل اور کشف کے آنے سے پہلے وہ دونوں ہی ان کے خوابوں کا مرکز تھے۔ ان کے آنے کے بعد بھی انکا پیار شرجیل

کے لیے کم نہیں ہوا تھا بلکہ اکلوتا ہونے کے باعث وہ خاندان بھر کا چہیتا تھا۔

شرجیل اور صلہ نے سات سال اکلوتا ہونے کے مزے اڑائے تھے۔ پھر رائیل اور کشف کے آجانے سے شرجیل کا مقام تو وہی رہا البتہ

صلہ کے لیے قدرے بدل گیا۔ ان دونوں نے سب سے چھوٹے ہونے کے باعث خوب محبت سمیٹی تھی۔ مگر صلہ سے اکلوتا ہونے کا اعزاز تو چھین ہی

گیا ساتھ میں وہ صرف ان دونوں کی بڑی بہن بن کر رہ گئی۔ جسے ہر وقت ان کا خیال رکھنے کی تاکید کی جاتی۔ اسی طرح شیر کی بھی بس چھوٹی بہن

کے طور پر لی جانے لگی جسکا اپنے بڑے بھائی کی ہر فرمائش پوری کرنا فرض سمجھا جانے لگا۔ اس نے دونوں کرداروں کو کم عمری میں ہی بخوبی سمجھ لیا تھا۔

اور اپنوں سے جڑی امیدوں کو اپنی بنی کہانیوں اور ان میں بسنے والے کرداروں کی دنیا تک محدود کر لیا۔ ترجیحات یکسر بدل ڈالیں۔ وہ خود کی بنائی دنیا میں مگن اور خوش تھی۔ پھر 12 سال پہلے ہمارے گھر والے اسی محلے میں رہنے آ گئے تھے اور اسے اپنے ساتھ اپنی دنیا میں گھمانے کو ایک ساتھی مل گیا تھا۔ ابا کی خواہش کے برعکس شیری نے کمپیوٹر سائنس میں میٹرک کیا تھا اور آئی سی ایس کرنے کے بعد اس نے ابا کی ناراضی کے باوجود سکولرشپ کے لیے اپلائی کر دیا تھا۔ وہ ذہین تھا۔ سو باہر جا کر پڑھنا اس کے لیے کچھ مشکل نہ تھا۔ بے جالا ڈیپار کے باعث وہ بہت خود سر ہو گیا تھا۔ اس کے انٹر کرتے ہی اس کی مگنی ہمارے کردی گئی تھی اور وہ سراسر اس کی پسند سے کی گئی تھی۔ مگر سکولرشپ کے لگتے ہی وہ چلا گیا تھا۔ بنا کسی کو منائے بنا کسی کو کوئی خوش فہم سی امید دلائے۔ اگر اس وقت وہ ابا کو اعتماد میں لینے کی کوشش کرتا تو وہ بخوشی اجازت دے دیتے۔ آخر کو وہ انکا چہیتا بیٹا تھا۔ پر جانے وہ کونسے ایگورٹریک پر چل نکلا تھا۔ اس کے جانے کے بعد سے ابا بالکل بدل کر رہ گئے تھے۔ بچوں کی ذمہ داری پہلے کی ہی طرح خوش اسلوبی سے نبھا رہے تھے۔ فرق بس یہ آیا تھا کہ اولاد کے حوالے سے انہوں نے خواب سجانے چھوڑ دیے تھے۔

.....☆.....

وہ بہت نروس تھی۔ آج کام پر اس کا پہلا دن تھا۔ اور پہلا شارٹ اس کا بہت برا گیا تھا۔ حالانکہ اس نے بہت محنت کی تھی۔ نسیم بادی نے اس کی ہمت بندھائی۔ فون کر کے اس صلہ کوہ منہ بھر بھر گالیاں دیں تھیں۔ کہ وہ ہوتی تو وہ اس قدر کنفیوز نہ ہوتی۔

”پریشان لگ رہی ہو؟“ زارا حیات اس کے برابر کرسی کھسکا کر بیٹھی تھی۔

”نہیں تو۔“ وہ نارمل سے انداز میں بولی۔ البتہ چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

”ریلیکس یار۔ پہلا دن تو سب کا ایسے ہی ہوتا ہے۔ تم دل برا مت کرو۔“

اس نے دوستانہ انداز میں کہا۔ ہمارے سر کو خفیف سی جنبش دی۔ تو کیا ہوا ایکٹنگ ٹھیک سے نہیں کر پائی۔ ہر کسی کے سامنے رونا دوڑنے والوں میں نہیں تھی وہ۔ اس کا اگلا سین شاہو کے ساتھ تھا۔ نسیم بادی اسے اپنے ہر پروجیکٹ میں اہم رول آفر کرتے تھے۔ اور اس کی بدولت اس کا فن نکھر کر سامنے آیا تھا۔ وہ کبھی مرکزی کردار نہیں لیتا تھا۔ بلکہ وہ کردار منتخب کرتا تھا جو کہانی کا تحتہ پلٹ دے جو اکثر کلائمیکس میں زور پکڑتا تھا۔ اسے ہر دوسرے ڈرامے میں آنے سے چڑھتی۔ مگر نسیم بادی کی بات اور تھی۔ وہ اس کے میٹور تھے۔ یہ وہی تھے جنہوں نے اسے بالاج سے شاہو بنایا تھا۔ اور وہ احسان فراموش نہیں تھا۔ بلیو جینز پر سیاہ کرتا پہنے کہنیوں تک آستین فولڈ کیے۔ ہلکی جڑھی شیو اور قدرے لمبے بالوں میں جو اس کے تکیے نقوش سے مزین چہرے پر بہت سوٹ بھی کرتے تھے۔ بالکل کسی ڈگر ڈگر منڈلانے والے لکھاری لگ رہا تھا۔ وہ بلا کا جامہ زیب تھا۔ اور اپنی متناطیسی شخصیت کا اسے پوری طرح احساس تھا۔ آئے دن کسی ماڈل یا اداکارہ کے ساتھ افیئرز کے چرچے میگزینز میں ہوتے رہتے تھے۔ وہ ان کی تردید کرتا اور نہ ہی تائید اسے اس سب سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔

اس کے چہرے پر چھائی گہری سنجیدگی اور تیاری دیکھ کر ہمارے سبے اوسان بھی خطا ہونے لگے۔ اس کا جی چاہا زمین پھٹے اور وہ اس میں سما جائے۔

”چلیں جی شروع کریں۔“ نسیم بادنی کی اونچی آواز پر اس کی روح فنا ہو گئی۔ وہ مرے مرے قدم اٹھاتی فریم ایریا میں چلی آئی۔ ایسے جیسے کو کوئی قتل میں جاتا ہے۔

بالاج نے ایک اچھتی نگاہ اس پر ڈالی تھی اور بے اختیار نسیم بادنی کی چوٹس کو داد دی تھی۔ وہ واقعی اس کردار کے لیے بنی تھی۔ نرم و نازک سراپا، دلکش نقوش اور معصوم سا چہرہ۔ وہ بار بار ماتھے پر آیا پسینہ خشک کر رہی تھی۔ اس نے ایک نظر نسیم صاحب پر ڈالی۔ وہ ایکشن کہنے کو بالکل تیار تھے جبکہ سامنے کھڑی لڑکی کی تیاری صفر لگ رہی تھی۔ ان کے ایکشن کہتے ہی وہ فارم میں آ گیا مگر ہاتھ تو عنقریب بے ہوش ہوتی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ چند لمحے سوچ میں پڑ گیا۔

”کچھ پوچھ سکتا ہوں آپ سے؟“ وہ تسلی سے پیچھے ہاتھ باندھے پوچھ رہا تھا۔ ہما چوکی۔ ”جی؟“ یہ لائن تو نہیں تھی اس کی۔ ”ویسے ہی جنرل نانچ کے لیے پوچھنا چاہ رہا تھا۔“ اس نے اچنبھے سے نسیم انکل کو دیکھا ”وہ سب سے بے نیاز VTR پر مصروف تھے۔ جیسے وہ صحیح لائنز بول رہا ہو۔ وہ شش و پنج میں پڑ گئی۔

”لڑکیوں کی عمر کے بارے میں پوچھنا تو نہیں چاہیے مگر مجھے لگ رہا ہے آپ غلط جگہ آ گئی ہیں۔“ وہ ماتھے پر ہل لیے خشک انداز میں پوچھ رہا تھا۔

”ک۔ کیا مطلب آپ کا۔“ وہ نا سمجھی کے عالم میں بولی۔

”مطلب یہ ہے بی بی کہ یہاں سنجیدگی سے کام ہوتا ہے۔ بچوں کا کھیل نہیں ہے کہ کوئی بھی ایریا غیر ایریا گاؤ دی آ کر ایکٹرن بن جائے۔“ اس کے انداز پر ہما سلک کر رہ گئی۔ گاؤ دی کہہ کر اس نے اس کی دکھتی رگ پر گویا پاؤں رکھ دیا تھا۔ یہ وہ واحد لفظ تھا جس سے اس کو بلا کی چڑ تھی۔

”سمجھتے کیا ہیں آپ خود کو۔“ سارا لحاظ بالائے طاق رکھ کر وہ میدان میں اتری۔ کراچی میں رہ کر خود کو انگریز سمجھنے لگتے ہیں۔ سوکھی سڑی

لڑکیاں مطلب کم عمر ہوتی ہیں آپ کے لیے۔ گاؤں والوں کو جاہل گنوار سمجھ رکھا ہے چاہے اپنے باپ دادا چار پائیوں پر بیٹھ کر طشتریوں میں سڑپ سڑپ چائے پیتے ہوں۔“ بالاج نے قدرے برہمی سے نسیم صاحب کی جانب دیکھا۔ انہوں نے ہلکی سر کی جنبش سے اشارہ کیا۔ ایک اشارہ انہوں نے پہلے سے تیار کمرہ میں کو بھی کیا وہ خلاف توقع جلدی بھڑک اٹھی تھی۔

”تو گاؤں والے بھی خود کو بڑا خالص اور مکھن جیسا سمجھتے ہیں اور ہمیں منافق جبکہ اچھے برے ہر جگہ ہوتے ہیں۔“ وہ اب اپنی لائنز بھول رہا تھا۔

”اب ایسی بھی بات نہیں ہے۔ آپ ہمیں انڈرا سٹیمیٹ کریں گے تو جوابی حملہ بھی تو ہو گا نا۔“ اس نے بھی جواب دینے کو سرکھٹ کا سہارا لیا۔ نسیم بادنی زیر لب مسکراتے دیکھ رہے تھے۔ نسیم بادنی اور بالاج کا مشترکہ حربہ تمام نئے چہروں کے لیے ہمیشہ کارگر ہوتا تھا۔

یہی نوک جھونک اس سین میں مطلوب تھی۔ اور وہ یہ سمجھ رہی تھی کہ پہلے دن اس کی ٹانگ کھنچائی ہو رہی ہے۔ اس کی تو وہ پوری تیاری کر کے آئی تھی۔

وہ لوگ پہلے گوجرے میں رہتے تھے۔ بارہ سال پہلے لاہور شفٹ ہونے کے باوجود اس کی بہت سی عادتیں ابھی بھی خاصی پینڈوانہ تھیں۔ اور اس کا فائدہ وہ سامنے والے کو کم ہی اٹھانے دیتی تھی۔ نسیم صاحب کے کٹ بولنے پر وہ جیسے ہوش میں آئی تھی۔ انہوں نے اسے شاباش دی تو چند لمحے اسے یقین ہی نہیں آیا۔ بالاج پہلے ہی جا چکا تھا۔ وہاں پر موجود سب لوگوں کے چہروں پر تحسین آمیز تاثر تھا۔ وہ جھینپ سی گئی۔ کام مکمل ہوتے ہی وہ الگ تھلگ گوشے میں آ بیٹھی۔ صلہ کو بتائے بغیر اس کا کھانا کہاں ہضم ہونا تھا۔ سوہا ضمے کی گولی کھا کر وہ سکون سے آگے کے لیے سوچنے لگی۔ لاہور کے اس چھوٹے سے ٹاؤن میں انہیں زیادہ کام نہیں تھا۔ اصلی کام کراچی میں ہونا تھا۔ وہاں اس کے ماموں رہتے تھے سوہا کو تو کوئی اعتراض نہیں تھا۔ صلہ ان دنوں از حد مصروف تھی۔ صبح کی گئی آٹھ بجے لوثی تھی۔ اس نے اپنے ابا کو نہیں بتایا تھا کہ وہ نسیم صاحب کے ساتھ اب کام نہیں کر رہی۔ یہ بات وہ دونوں اور نسیم بادی جانتے تھے۔ لہذا بڑے آرام سے ان سے یہ بات چھپالی گئی ورنہ یہ سنہری مواقع اس کے ہاتھ سے چلا جاتا۔ ان کے خیال میں تو ان کی دونوں بچیاں ان کے بہترین دوست کی نگرانی میں تھیں۔ قریباً ڈیڑھ ہفتے کی بھرپور لڑائی کے منظر فلم بند کرنے کے بعد اب وہ کراچی جا رہے تھے۔ شاہو جو اس گاؤں میں کسی کہانی کی تلاش میں آیا تھا۔ اب واپس اپنے گھر کراچی لوٹ رہا تھا۔ جبکہ ہما اور اس کی بہن کا کردار ادا کرتی انعم قریشی پڑھنے کے لیے کراچی جا رہے ہیں۔ جہاں بگ سٹی گرل زارا حیات سے ان کی ملاقات ہوئی تھی اور کہانی آگے بڑھنی تھی۔ مرکزی کردار اعفان باری اور زارا حیات ادا کر رہے تھے۔ جبکہ بالاج اور ہما کا رول قدرے مختصر مگر دلچسپ تھا اور نہایت اہم بھی۔

.....☆.....

وہ پلیٹ میں مسلسل چبچ بھار رہی تھی اور کن اکھیوں سے ٹیبل کے گرد بیٹھے نفوس کو رغبت سے کھانا دیکھ کر وہ بد مزہا ہوئی۔

زارا حیات کراچی کی ہی رہنے والی تھی سو وہ سٹیگیٹی اور نوڈلز سب کے لیے بنا کر لائی تھی۔ ہما چٹ پٹے کھانے کی عادی تھی۔ اٹلیٹین نوڈ اور چائیز دونوں سے ہی اسے انتہا کی چیز تھی یہاں تک کہ پیزا بھی وہ کھا نہیں سکتی تھی۔ نسیم بادی کسی خاتون کا تذکرہ کر رہے تھے جنہوں نے کچھ دنوں میں انہیں آ کر جوائن کرنا تھا۔ شہر والی سائیڈ کا سارا کام ان کے ذمے تھا اور نسیم بادی کا گاؤں کی کاسٹ کو سنبھالنا اور گائیڈ کرنا تھا۔ اب گاؤں والے کردار شہر آ گئے تھے۔ بقیہ نسیم صاحب اور ان خاتون نے مل کر کرنا تھا۔ وہ بے دلی سے سب کی گفتگو سن رہی تھی۔ ٹیبل پر صرف وہ اور بالاج خاموشی سے کھانے میں مصروف تھے۔ جبکہ اعفان باری بہت باتونی تھا اور زارا حیات بھی۔ دونوں پروجیکٹ کے سلسلے میں انہیں بہت سے مشورے دے رہے تھے۔ جن کا لکھ بھی اس کے پلے نہیں پڑ رہا تھا۔

”ہاں وہ تو بہت قابل ہدایتکار ہیں۔ ان کے ساتھ کام کرنے کا لطف یہ ہے کہ وہ کبھی بور نہیں ہونے دیتیں۔ بہت زندہ دل اور خوش مزاج خاتون ہیں۔“ وہ غالباً انہی خاتون کی تعریفوں میں لطیف اللسان تھا۔ ہما جی بھر کر بد مزہا ہوئی ایک تو اس شخص کو ہر کسی کی تعریفیں کرنے کی بہت عادت ہے۔ مجھے بھی پتا نہیں کیوں ایسے بونگے ہی پسند آتے ہیں۔“ وہ اسے بغور آبزور کرتی تھی اور جتنا اس نے غور کیا اتنی ہی مایوسی ہوئی۔

”ارے ہما! آپ نے تو کچھ لیا ہی نہیں۔“ زارا نے اس کی پلیٹ میں تھوڑی سی سٹیگیٹی دیکھتے ٹوکا تھا۔

”تو تھینکس۔ میں نے ناشتہ ذرا ہیوی کیا تھا۔“ اس نے مسکراتے معذرت کی۔ کراچی میں گزارے ایک مہینے میں اس کے فاقوں کی نوبت

”حق ہا.....“ اس نے لمبی آہ بھری۔ مت پوچھو یا ر۔ مای جی تو یہاں آ کر ایسے انگریز ہوئی ہیں جیسے گوجرے سے کراچی نہیں امریکہ آگئی ہوں سڑے ہوئے تو س انڈا چائے۔ لٹج میں عجیب و غریب چائیز کھانے۔ بخ..... اور پراٹھے تو انہیں ہضم ہی نہیں ہوتے۔ یونو ہاؤ ہیوی دے آر۔“ وہ ان کے جیسے پوز مارتی بولی۔ صلہ سربلاتی ہنس دی۔ ہما مشاق ڈرائیور تھی۔ رش میں بھی وہ قدرے تیز رفتاری سے چلا رہی تھی۔ صلہ نے تری نگاہوں سے اسے گیسر لگاتے دیکھا۔

”ہما تم کتنی اچھی ہو اور یہ چوڑی دار پا جاے میں سرخ فرائ کتنی بچ رہی ہے تمہیں۔ بالکل مغلیہ شہزادی لگ رہی ہو۔“ وہ اسے چکارہ کرتے بولی۔ ”ہیں.....؟ اسکے خوشامد انداز پر ہما بے ہوش ہوتے ہوتے ہنسی۔ پھر اس کا انداز جانچتے زور سے نفی میں سربلانے لگی۔

”نہ نہ بالکل نہیں..... زمیں ادھر کی ادھر ہو جائے یا آسمان ٹوٹ پڑے۔ جان دے دوں گی مگر گاڑی تمہیں نہیں چلانے دوں گی۔ جتنی مرضی خوشامد کر لو۔ بھی آخر مجھے بھی تو زندہ رہنے کا حق ہے.....“ وہ بھی اس کی رگ رگ سے واقف تھی۔ سوکانوں کو ہاتھ لگاتے بولی۔ اس کی خطرناک ڈرائیونگ نے اس کے باغیچے کے کئی گملے توڑے تھے۔

”انتہائی زہر لگ رہی ہو تم اس وقت۔“ ارمانوں پر پانی پڑتا دیکھ کر اس نے برا سامنہ بنایا۔ ”تھینک یو تھینک یو۔“ ہما ہنس دی۔

”بائی دی وے Congrats تمہارا وہ پرورجیکٹ جسکی خاطر تم نے مجھ سے بے وفائی کی خاصا کامیاب چل رہا ہے۔“ وہ خوشدلی سے بولی۔ ان ڈائریکٹر صاحب کی لمبی غیر حاضریاں سارے میں مشہور میں تھیں۔

”شکریہ.....“ صلہ کے چہرے پر خوبصورت سی مسکراہٹ ابھری تھی۔

”ویسے اتنی جلدی تم فارغ کیسے ہو گئیں۔“ اس نے تیزی سے موڑ کاٹا تھا۔ وہ قدرے کھلی سڑک پر آگئے تھے۔

”ڈائریکٹر صاحب کو ان کی کام چوری پر اپنے پروڈیوسر بھائی صاحب سے خاصی ڈانٹ پڑی تھی۔ سو کام پورا ہونے سے پہلے ہی فائر کر دیا مجھے۔“ وہ عام سے لہجے میں بولی تھی۔ جبکہ ہما ہکا بکا رہ گئی۔

”صلہ۔ کیا مطلب فائر کر دیا۔ ساری محنت تم نے کی اور وہ انگلی کٹا کر چلے شہیدوں میں اپنا نام لکھوانے۔“ اسے حقیقتاً صدمہ ہوا تھا۔

”کیا فرق پڑتا ہے یا ر۔ مجھے اکیلے کام کرنے کا تجربہ چاہیے تھا سو وہ مل گیا۔ نام میں کیا رکھا ہے۔ ایسی چھوٹی باتیں تو ہوتی رہتی ہیں اس فیلڈ میں۔“ اس کے لا پرواہ انداز پر ہما ششدر رہ گئی۔ ”کیا مطلب فرق نہیں پڑتا۔ کم از کم کریڈٹس میں تمہارا نام آنا چاہیے۔“

”کوشش کر کے دیکھ لو، کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔“ وہ کندھے اچکاتی باہر دیکھنے لگی۔

”اس کی ایسی کی تیمی۔ اٹکل سے بات کروں گی۔ تم نے تو کچھ کرنا نہیں ہے۔ اپنے گول تک پہنچنے کے لیے اس سے تمہارا نام اسٹیمپلش ہونا بہت ضروری ہے۔

”اچھا بی بی بقرط۔ آہستہ چلاؤ گاڑی۔ مجھے اس بالی عمر میں اوپر نہیں جانا۔“ اس نے تیزی سے اوور ٹیک کرنے سے گھر کا۔

”ایک تو تم بڑی جیلنس ہو میری ڈرائیونگ سے..... تم تو ہمیشہ۔“

اس کا دھیان بنانے میں کامیاب ہوتے ہی وہ پھر باہر کے نظاروں میں مشغول ہو گئی۔ موسم خاصا خوشگوار تھا۔ سڑک کے گرد قطار میں لگے درخت ہوا سے ادھر ادھر لہرا رہے تھے۔

”ویسے تم نے اس دفعہ بالکل نئے لوگوں کے ساتھ کام کیا ہے۔ کوئی گھنٹی ونٹی بجی؟“ وہ شوخ ہوئی۔ ”کتھے یار۔“ اس نے مصنوعی آہ خارج کی۔ ”بڑی کوشش کی مگر کسی کو دیکھ کر حواس باختہ نہیں ہوئے۔ پتہ نی کدوں آوے گا میرے ہوش اڑانے والا۔“ ”تم اپنی کہانیوں اور ڈراموں کی دنیا سے باہر آؤ تو تمہیں کوئی اچھا لگے نا۔ اپنے گرد یہ جو حصار باندھ رکھا ہے کسی کو اندر گھسنے کی اجازت نہیں دیتے ہو تو یہ ان لوگوں کے ساتھ زیادتی ہے جو تمہاری خلوص سے بڑھتے ہیں۔“ وہ ہمیشہ کی طرح اسے سمجھانے بیٹھ گئی۔

”مزے کی بات بتاؤں یہ جو تم نے فلسفہ جھاڑا ہے نا۔ سیم ٹوسیم ایک ڈرامے میں ڈائلاگ تھا۔“ وہ اس کی باتوں کو یونہی فلسفہ کہہ کر ٹال دیا کرتی تھی۔ مگر وہ آج نلنے کے موڈ میں نہیں تھی۔

”بکومت۔ تمہیں وہ آصف یاد ہے؟ بیچارہ کتنی خوشدلی سے تمہاری طرف بڑھا تھا۔ مگر تم صدا کی ناقدری۔“ اسے انکا یونیورسٹی فیلو یاد آ گیا تھا۔ ”وہ تمہیں کہاں سے یاد آ گیا اور یہ تم مجھے ایک ہی طرح کے لیکچرز دے دے کر بور نہیں ہوتی۔“ وہ ہنوز بیڈیا زباہر دیکھنے میں مصروف تھی کہ آصف کے نام پر چونک پڑی۔

”اس لیے لیکچرز دیتی ہوں کہ اگر یہی حال رہا تو اکیلی رہو گی ہمیشہ۔ یہ جو تم سبکو سرسری سا دیکھتی ہو اور ان کے بارے میں اچھی بری رائے قائم نہیں کرتی ہو یہی وجہ ہے کہ تمہیں اگلے بندے کی خوبیاں بھی نظر نہیں آتی۔ اور یہ بھی نظر نہیں آتا کہ وہ تمہاری طرف خلوص سے بڑھا ہے۔“ ”مجھے کسی سے کیا لینا دینا۔“ وہ چڑسی گئی۔ ”چھوٹے موٹے کرش تو روز ہی ہوتے ہیں اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ ہم اس پر محبت کا خول چڑھا کر خود فریبی کا شکار ہو جائیں۔ روشنی تیز ہو تو نظریں خود بخود جھک جاتی ہیں۔ جھکانے کا تردد نہیں کرنا پڑتا۔“

”آج کے دور میں ایسی محبتیں ڈھونڈو گی تو خالی رہ جاؤ گی۔ بعض دفعہ دوسروں کی محبت کا بھی خیال کر لیتے ہیں۔“ ہما نے سمجھایا۔ ”تمہیں کیا مل گیا محبت کر کے آج کے دور کی۔ جو مجھے مشورے دیتی ہو۔“ وہ یکدم سنجیدگی سے بولی تو ہما چپ ہو گئی۔

”بڑے بڑے عہدہ پیمان کی بیڑیاں لڑکیوں کے پاؤں میں ڈال کر خود سارے جہان میں دندناتے پھرتے ہیں اور لڑکیوں سے امید کرتے ہیں کہ چاہے قیامت آجائے ایک عدد بے وقوف کہیں نہ کہیں بیٹھی ان کا انتظار کر بڑے ذوق و شوق کر رہی ہو گی۔“ روانی میں کہتے بھی اسے ہما کے دھواں دھواں چہرے کا احساس تھا۔ وہ سوائے دکھ کے کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ اس بے نام مسافت پر وہ اسے چلتے رہنے نہیں دینا چاہتی تھی۔ چند لمبے خاموشی سے ریت کی مانند پھسل گئے۔

”ان کا کوئی فون آیا؟“ صلہ نے سامنے سڑک پر نظر جمائے سپاٹ لہجے میں پوچھا تھا۔ ”نہیں۔“ ڈرائیونگ کرتے وہ بہت آہستگی سے بولی تھی جو بمشکل وہ سن پائی صلہ ایک متاسف نظر اس پر ڈال کر ونڈ سکرین سے باہر دیکھنے لگی۔

”میری بھی کافی دنوں سے بات نہیں ہوئی۔ امی کو بھی کوئی فون نہیں کیا اتنے دنوں سے۔“ وہ جیسے خود کلامی کر رہی تھی۔ ہمارے دل میں ہوک سی اٹھی تھی۔ جانے کے بعد اس نے ایک بار کال کی تھی جس میں صلہ کے بقول لمبے عہد و بیان باندھے گئے تھے کہ جیسے ہی سیٹلڈ ہو جائیں گے تو اسے وہاں بلا لیں گے۔ اس کے بعد اس کا کوئی فون نہیں آیا تھا۔ دو تین بار اس کے والدین نے رابطہ کیا تھا۔ جس میں ہر بار اس نے یہی بات کی تھی۔ سات سال ہو گئے تھے انتظار کرتے کرتے۔ یہ واحد ٹاپک تھا جس پر دونوں خاموش ہو جایا کرتی تھیں۔ ایک مجرم سی خاموشی اب بھی ان کے درمیان ڈرائی تھی۔ گاڑی اب قدرے تنگ سڑک پر چل رہی تھی۔ بائیں جانب وسیع اور کشادہ پارک تھا۔ صلہ اس پارک میں لگے خوشنما پھولوں کو دیکھ گئی۔ ہمارے طرح اس کا دھیان بھی ماضی کی گریہوں میں الجھا تھا۔ دفعتاً ہمارا ڈیش بورڈ پر پڑا فون بجا۔ اس سے پہلے کہ وہ فون اٹھائی۔ گاڑی ایک جھٹکے سے رکی۔ ٹائر یکدم رکنے کے باعث روز سے چرچرائے تھے۔ صلہ ہمارے چیخ پر گڑبڑائی تھی جو بریک لگاتے وقت اس نے ماری تھی۔ ”کیا ہوا؟“

ہمارے چہرہ لیے آنکھیں پھاڑے سڑک پر دیکھ رہی تھی۔ ”کسی کو نیچے دے دیا کیا؟“ اس نے ڈرتے ڈرتے پوچھا تھا۔ ہمارے ہنوز آنکھیں پھاڑتے سر اثبات میں ہلایا تھا۔ صلہ کی تو جیسے روح فنا ہو گئی۔ ”کہا بھی تھا سپیڈ کم کرو۔ مگر تم صدا کی شوخی..... کدھر ہے وہ؟“ اس نے زخمی کی تلاش میں نظر دوڑائی مگر دور دور تک کوئی نشان نہیں۔ ”کیسے دیا ہے تم نے نیچے۔“

”کتے کو۔“ اس کے حلق سے بمشکل آواز نکلی تھی۔ ”پتا نہیں کہاں سے سڑک کے بیچ میں آن کھڑا ہوا تھا۔“ صلہ نے سکھ کا سانس لیا۔ منہ کو آیا کلیجہ واپس اپنے مقام کو پہنچ گیا۔ ”شکر ہے یہ امریکہ نہیں ورنہ جیل میں جانا پڑتا۔ تم کیا بت بنی بیٹھی ہو گاڑی سائیڈ سے نکالو اس کی نماز جنازہ پڑھ کر جانا ہے۔“ اس نے اسے جھنجھوڑا۔

”صلہ ذرا جا کر دیکھو شاید زندہ ہو۔ غور سے سنو اس کی ہلکی ہلکی غرغراہٹ سنائی دے رہی ہے۔“ وہ ابھی بھی حواس باختہ لگ رہی تھی۔ ”تم پاگل تو نہیں ہو گئی۔ میں کیوں دیکھوں۔ زندہ ہو یا زخمی، کتنا کتا ہوتا ہے۔ اس نے مجھے کاٹ لیا تو۔“ وہ دونوں ابھی بحث میں مصروف تھیں کہ اچانک ایک معمر ادھیڑ عمر مرد بمع ہم عمر خاتون سڑک کے کنارے سے نمودار ہوئے۔ آدمی نے ڈھیلی ڈھالی ٹی شرٹ اور جینز پہن رکھی تھی۔ اور خاتون ریڈ پائپنگ سے مزین سکائی بلیو شلوار قمیض پر ریڈ پریٹڈ دوپٹہ ایک کندھے پر ڈالے ہوئے تھیں۔ میک اپ سے بے نیاز چہرے پر فکر کی لکیریں واضح تھیں۔ وہ انہی کی طرف بڑھ رہے تھے۔ ان دونوں کو قریب آتے دیکھ کر صلہ کی اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی نیچے رہ گئی۔ البتہ ہمارے کتے پر جھکتا دیکھ فوراً گاڑی سے اتری تھی۔ وہ سفید نرمز والا بہت خوبصورت کتا تھا جو ہولے ہولے سانس لے رہا تھا۔ شاید مکر کتنے کے ڈر سے بے ہوش ہو گیا تھا۔

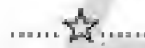
”مائی گڈ نیس۔ جیک یو آل رائٹ؟“ وہ گود میں بھر کر اسے ہوش میں لانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ وہ ان کا پالتو کتا تھا جو غلطی سے سڑک پر آ نکلا تھا۔ بغیر ڈائی کیے سیاہ و سفید بالوں کا امتزاج ان کے سرخ و سفید رنگت پر بہت عجیب رہا تھا۔ دونوں کو دیکھ کر ایک ہی لفظ دماغ میں آتا تھا ”گریس فل۔“ صلہ بھی باہر نکل آئی تھی۔ ہمارے ایکسکیزو زکر رہی تھی جبکہ وہ معمر آدمی مسکرا کر کوئی بات نہیں ”کہہ رہے تھے۔ البتہ وہ خاتون مسلسل پریشان سی اس کے سر پر ہاتھ پھیرتی ہوش میں لانے کی سعی کر رہی تھیں۔

”آپ آجائیں ہم آپ کو ہسپتال لے جاتے ہیں۔“ صلہ نے آفر کی۔

”نہیں بیٹا اس کی ضرورت نہیں یہ قریبی پارک میں ہم آئے ہوتے تھے۔ وی دل بیچ۔ آپ لوگ جاؤ۔“ وہ مطمئن سی کہتیں اور واپس جانے کو قدم بڑھا دیے تھے شاید انہیں احساس ہو گیا تھا کہ کوئی چوٹ نہیں لگی۔ اس نے بروقت بریکس لگا لیے تھے۔

ان کے جاتے ہی ہمارے با آواز بلند شکرا دیا اور گاڑی میں بیٹھ گئی۔ صلہ ایک تک ان دونوں کو جاتا دیکھ رہی تھی۔ یہاں تک کہ وہ نظروں سے اوجھل ہو گئے۔

”تم بھی عجیب ہو صلو۔ تمہاری فیورٹ سٹار تمہارے سامنے اور تم نے آٹو گراف تک نہیں لیا۔“ اس نے گاڑی سٹارٹ کرتے کرتے خاموش بیٹھی صلہ پر نظر ڈالی۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ”ویسے وہ دونوں کتنے کیوٹ لگ رہے تھے۔ ریکل لائف میں وہ آج بھی بہت خوبصورت ہیں۔ جی ناں۔“ اس نے اس سے تائید چاہی تو فقط مسکرا کر رہ گئی۔ ”وہ واقعی زریہ خان تھیں؟“ زندگی میں اسے اتفاقات بھی ہوتے ہیں۔ وہ متحیر سی سوچے گئی۔



وہ شوٹنگ ختم کر کے کامن روم سے متصل میک اپ روم میں بیٹھا تھی۔ اس پروجیکٹ کو بطور کوڈائزڈ ایکٹر جوائن کیے انہیں دوسرا دن تھا۔ نسیم بادنی کراچی کے مشہور بازار میں ریکارڈنگ کے لیے گئے تھے۔ ان کے Small town کردار کراچی آئیں اور شاپنگ نہ کریں کیسے ممکن تھا۔ ان کے ساتھ بالاج، ہما اور دیگر فنکار گئے ہوئے تھے۔ جبکہ یہاں سنوڈ یوز میں شہر کے کردار ان کے ساتھ مصروف تھے۔ ”کیا ہوا؟ طبیعت تو ٹھیک ہے تمہاری۔“ ان کے شو ہر تفکر سے ان کے سامنے والی کرسی پر بیٹھے پوچھ رہے تھے۔

”ٹھیک ہوں۔ بس سر میں کچھ درد ہے۔ انہوں نے ٹالنا چاہا۔

”ٹیمپلٹ لادوں؟ یا ڈاکٹر؟“

”نہیں۔ بس کچھ دیر اکیلی رہنا چاہتی ہوں۔“ وہ سپاٹ سے لہجے میں قیامت سے بولیں۔ تو وہ گہری سانس لے کر رہ گئے۔ ایسے وقتوں میں وہ بالکل اجنبی بن جایا کرتی تھیں۔ انہیں اکثر ڈیپریشن ہو جاتا تھا۔ اور دنیا میں وہ واحد شخص تھے جو اپنی بیگم کے آئے دن بدلتے موڈ کو سنبھالنا جانتے تھے سو خاموشی سے ایک نظر ان پر ڈالتے وہ اٹھے اور باہر نکل گئے۔ جاتے جاتے دروازہ بند کرنا نہ بھولے۔ جانتے تھے وہ اب کسی سے ملنا پسند نہیں کریں گی۔ چھوٹے سے کمرے میں دروازہ بند ہونے کی دھمک باقی تھی۔ باوقاری وہ خاتون کمرے میں پڑی واحد چیمپر پر براجمان تھیں۔

لائٹ پنک قمیص کے ساتھ ہم رنگ ٹراؤزر میں ملبوس ٹانگ پر ٹانگ چڑھائے کرسی کی پشت سے ٹیک لگائے گہری سوچ میں گم تھیں۔ سیاہ شفاف آنکھیں چھت پر تکی تھیں۔ پرنٹڈ شیٹون کا دوپٹہ کاندھے پر جھول رہا تھا۔ ڈپریشن کے دورے بڑھتے جا رہے تھے۔ ڈاکٹر نے اینٹی ڈیپریشنٹ تک

Prescribe کر دی تھیں۔ مگر ان کی اپنی فلاسفی۔ ان کے مطابق غم کی بات، خوشی کی بات سے زیادہ خوبصورت ہوتی ہے۔ اپنے اندر جھانکنے کا موقع ملتا ہے۔ جانے کتنے پل یونہی ماضی کے دھندلکوں میں کھوئے گزر گئے۔ دفعتاً کامن روم کا دروازہ کھٹ سے کھٹا گویا کسی نے ٹھوکر مار کر کھولا ہو۔

سکون کی ندی میں جیسے پتھر آگرا تھا۔ ان کی محویت ٹوٹ گئی۔ پھر دھپ سے کوئی صوفے پر براجمان ہوا۔ بیگ زور سے اچھالا گیا تھا۔ وہ خاصی حیران

ہوئیں کہ اتنے مہذب کریو میں سے ایسا بے ترتیب کون ہے۔ وہ یکدم بدمزاج ہوئیں جو بھی تھا اگر وہ میک اپ روم میں دروازہ کھول کر آ جاتا تو اس کی خیر نہیں تھی۔ کیونکہ ایسے موڈ میں وہ کسی کو نہیں بخشتی تھیں۔

”کہاں مرگئی یہ ہما کی بچی؟“ وہ انہی سوچوں میں گم تھیں کہ اکتاہٹ بھری آواز ابھری۔

چند لمحے مزید سر کے تو وہ سر جھٹکتی سوچوں کا منقطع سلسلہ پھر وہیں سے جوڑ کر بیٹھ گئیں۔ لیکن اگلا حملہ ان کی سماعت میں سوراخ کر دینے کو کافی تھا۔ وہ کوئی لوک گیت تھا۔

”اوکھے پنڈے لمبیاں نے راواں عشق دیا.....“ مگن سے انداز میں گیت شروع کیا گیا تھا اور آخری الفاظ کو اچھا خاصا کھینچا گیا تھا اور وہ بھی انتہائی باریک آواز میں۔ ان کے دکھتے سر میں مزید لہروں کا اضافہ ہوا تھا۔

”کی دساں کی بات سناواں عشق دیا آ آ آ.....“ اب کی بار خاصی موٹی آواز میں گایا گیا تھا اور آخر میں اوپر اسٹونگ کے جوہر بھی دکھائے گئے تھے۔ وہ تو جیسے اپنے گھر کے ڈرائنگ روم میں بیٹھی تھی۔

انہوں نے اس خوبصورت کلام کی ایسی بے حرمتی کبھی نہیں سنی تھی۔ وہ بے اختیار سر تھام کر رہ گئیں۔

”انسان بن جاؤ تم شیدا.....“ دفعتاً دروازہ پھر کھلا تھا اور خوبصورت نسورتی آواز گونجی تھی۔

”اگر تم نے دوبارہ میرا نام اس بیہودہ طریقے سے بگاڑا تو میں تمہاری ٹنڈ کر دوں گی۔“ خدا کی پناہ۔ کہاں میں اور کہاں وہ شیدا کی واہیات جوانی۔“ پہلی والی لڑکی تپ کر بولی تھی۔

”ہاں جی انگور کھٹے ہیں۔“ آنے والی شرارتا چہکی۔

”اب ایسا بھی نہیں ہے۔ بس ہاسیٹ ہی اچھی ہے اس کی۔ پتا نہیں لوگوں کو کیا پسند ہے۔ اس لیے منہ والی میں۔“ وہ جل کر بولی تھی ہما ہنس دی۔ اور سامنے والے صوفے پر بیٹھ گئی۔ دونوں کو ہی میک اپ روم کے بند دروازے کا خیال نہیں آیا۔ درمیان میں بڑے ٹیبل پر ہما کا بیگ ادھ کھلا پڑا تھا۔

”ارے رندھاوا کیا بتاؤں تجھے۔ رات کو کیا کمال خواب دیکھا میں نے..... صلو کو یکدم یاد آیا تھا۔“ کوئی ہے تو نہیں؟“ اس نے آہستہ سے پوچھا انداز خاصا لا پرواہی لیے تھا۔ آدھا گھنٹہ باہر انتظار کر کے وہ کامن روم آئی تھی اور اس وقت ہما سے شکایت کرنا بھول گیا تھا۔

”میک اپ روز میں چیک کر لو۔“ ہما چپس کا پیکٹ کھولتی بولی۔ اندر بیٹھی خاتون پہلو بدلتی سخت کوفت زدہ ہوئیں۔ لیکن صلو پُر جوش انداز میں شروع ہو چکی تھی۔ ”چھوڑ پرے..... یار بلیک مرسیڈز اندر سے کتنی زبردست لگتی ہے یہ میں نے رات کو خواب میں جانا۔ کالی آندھی رات، تاحد نظر پھیلی اونچے درختوں سے گھری سیاہ تارکول کی سڑک اور سیاہ فراق پہنے ڈرائیونگ سیٹ پر براجمان صلو رحمان۔“ ہائے میں مر جاواں۔“ وہ ایکساٹنڈی تالی بجاتی بولی۔ مرسیڈز پر تو وہ دل و جان سے فریفتہ تھی۔ جواباً ہما کی ہنسی نکل گئی۔

”کیا لطیفہ ہے؟ صلو اور ڈرائیونگ.....“ چپس منہ میں ڈالتے اس نے گویا اسکی دکھتی رگ پر پاؤں رکھا۔

”دفعہ ہو جاؤ تم۔ جل کلاڑی کہیں کی۔“ وہ جل کر رہ گئی۔

”اچھا..... اچھا..... اب سیریس ہوں آگے بتاؤ۔“ وہ مسکراہٹ دباتے بولی۔

”نہیں شکریہ.....“ نکک کر کہتی وہ منہ پھلا کر بیٹھ گئی۔ ہا مسکرا دی جانتی تھی اب وہ نہیں بتانے کی۔

”اچھا یہ بتاؤں کہ تمہاری کہانی کہاں تک پہنچی؟“

”ماؤنٹ ایورسٹ تک.....“ وہ تپ گئی۔ ”تم میری جان چھوڑ دو تو کچھ کروں نا۔ سوچا تھا ساحل سمندر ہوگا، میں ہوگی، چائے کا کپ ہوگا،

میری فائل ہوگی اور تصور میں محور قصاں پورا عالم ہوگا۔“ اس نے زور سے ٹھنڈی آہ بھری۔ ”بھی تمہاری اس بے وفائی کا بدلہ بھی تو لینا تھا میں نے۔

ویسے تم کلائمیکس لکھنے آئی تھی یہاں۔ کوئی آئیڈیا ہے دماغ میں۔“ چپس کترتی پوچھ رہی تھی۔

”ہاں ہلکا سا منٹ ہے تو سہی۔ لکھنے بیٹھوں گی تو کچھ سوچے گا نا۔“

”تم اسے ناول کی فارم میں شائع کرواؤ گی۔ بھلا نسیم انکل کو دے دو۔ اچھا ڈرامہ بن جائے گا۔“ اس نے اس کی شکایت مستثر ہوئے

بغیر مخلصانہ مشورہ دیا۔

”بالکل نہیں۔ میری کہانی کا مرکزی کردار تھوڑا ٹیڑھا قسم کا ہے۔ کوئی بھی ایکٹر میری نظر میں اس سے انصاف نہیں کر پائے گا۔“ وہ قطعی

لہجے میں بولی پر یکدم سیدھی ہوئی۔ ذہن میں ایک خیال کو ندے کی طرح لپکا۔

”ارے..... لبوں پر پُرسوج انداز میں انگلی رکھے وہ رکی۔ مرکزی کردار نا سہی۔ ہیروئن تو بن سکتی ہو تم۔“

”اچھا۔“ اس کے اچھلنے سے بے نیاز چپس کھانے میں مصروف تھی۔ اپنے سائز سے بڑا تو اس کا چپس کا پیکٹ تھا۔

”واہ کیا پچویشن ہوگی۔ وہ اپنے خیالوں میں ہی خوش ہوئی اسنے دونوں ہاتھوں کو کیمرہ فریم کی طرح ہما کے چہرے پر فوکس کیا جو پیکٹ

میں جھانک کر جانے کو نئے غائبانہ چپس تلاش رہی تھی۔

”چھوٹا سا تاریک کمرہ۔ وحشت ناک سناٹا اور کالی اندھیری رات۔ مدھم مدھم روشنی۔ ہمارندھاوا ایک کرسی پر بندھی مدد کو پکار رہی ہے۔ مگر

آواز نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا کہ منہ پر کس کر پٹی بندھی ہے۔ وہ ہاتھوں کو زور سے ہلا کر آزاد کرانا چاہ رہی ہے مگر اس کے ہاتھ سختی سے پشت پر بندھے

ہیں۔ آنکھیں باہر کو ابلی پڑی ہیں۔ چہرہ خوف کے مارے زرد پسینے سے شرابور ہے۔“ صلہ کا لہجہ پُراسرار تھا۔ وہ جو چپس کے پیکٹ میں گم تھی قدرے

سیدھی ہو بیٹھی۔

”کیا ہیروئن کو کڈ نیپ کر لیا گیا ہے؟“ انداز میں دنیا جہاں کی معصومیت تھی۔ صلہ ”چپ کر کے سنو“ والے تاثرات دیتی ہنزا سے فریم میں

لیے آگے بڑھی۔ اس کے ساتھ 6 اور لوگ بھی یونہی بندھے بیٹھے ہیں۔ اور سب کرسیاں گول دائرے کی شکل میں رکھی گئی ہیں۔ تاکہ سب ایک

دوسرے کا موت کے خوف سے کانپتا وجود دیکھ سکیں۔ ”اندر بیٹھی خاتون لاشعوری طور پر متوجہ تھیں۔ کچھ بھی تھا مگر اس لڑکی کا منظر کشی کرنے کا انداز

خاصا دلچسپ تھا۔

”سب ایک دوسرے کو خوف سے تکر رہے ہیں۔ اور آزاد ہونے کو ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں۔ مگر انہیں بڑی مہارت سے باندھا گیا ہے۔ اب اینٹری ہوتی ہے مرکزی کردار کی۔“ اس نے ہاتھوں کے بنے فریم کو کامن روم کے دروازے کی جانب موڑا۔ ”ہیرو مجھے بچانے آیا ہے کیا؟“ ہما نے جیسے سکھ کا سانس لیا تھا۔ مگر صلہ اپنے خیال میں گمن سے انداز میں چلتی صوفے پر چڑھ گئی ہما کنارے ساتھ جا گئی۔ ”کمرے کے سنائے میں ایک بھیا نک قہقہہ گونجتا ہے۔ ایک انتہائی پیئڈ سم بندہ زور زور سے ہنستا ان لوگوں کی جانب بڑھتا ہے۔ تھری پیس سوٹ میں ملبوس بڑی بڑی سرخ آنکھوں والا۔ اس کے ہاتھ میں ایک بڑا سا ہتھوڑا ہوتا ہے۔ جسے وہ زور زور سے ہلاتا ان کی جانب بڑھتا ہے۔ وہ ساتھ ساتھ ہاتھوں کے بنے فریم کو بھی حرکت دے رہی تھی گویا وہ کردار اسی کمرے میں ہو اور ان کی جانب بڑھ رہا ہو۔

”وہ یونہی زور سے ہنستا کرسیوں کے گول دائرے کے گرد چکر کاٹ رہا ہے پھر وہ اچانک ہما کے سامنے والی کرسی کے پشت پر کھڑا ہو گیا۔ اس کا خوبصورت چہرہ اس وقت انتہائی مکروہ لگ رہا ہے۔ یکا یک اس پر جنون سوار ہو گیا اور اس پے در پے ہتھوڑے سے اس شخص کے سر پر وار کرنے شروع کر دیے۔“ ہما جولا پرواہ سی بیٹھی تھی یکدم چونکی تھی۔ چہرے سے ہوائیاں اڑ رہی تھیں وہ بلا کی ڈرپوک تھی۔ کسی ہو ر فلم کا صرف منظر ہی سنا وہ تو اس کے حواس اڑنے لگتے تھے۔ جبکہ صلہ رج کہ ڈراؤنی فلمیں دیکھتی تھی۔

صلہ کے فریم میں سامنے والا صوفہ تھا۔ اس آدمی کی آنکھیں ابل پڑیں۔ ڈھیر سا ر خون اور اس کا بھیجا بھی باہر کو ابل پڑا۔ دماغ کی نیس بہتی ہوئی اس کے چہرے پر آنے لگیں۔

”صلہ تم اتنی خونی قسم کی رائٹر تو نہیں تھی۔“ ہما کی آواز میں دبا خوف بھانپ کر وہ بمشکل ہنسی ضبط کر پائی۔ اور ہنوز جان لیوا سنجیدگی طاری کرتے پھر بولی۔ ”آہستہ آہستہ وہ سبکو یونہی جارہا نہ انداز میں مارتا گیا مارتا گیا۔“ اس کا انداز ڈرامائی رنگ لیے ہوئے تھا۔ ”اور ہما تھر تھر کا پنتی سبکو باری باری مرتے دیکھ رہی تھی۔ اس کا دل زور سے دھڑک رہا تھا جیسے ابھی سینہ توڑ کر باہر آجائے گا۔ سر پر ناچتی موت کی دہشت سے اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ اور پھر وہ ولن والا قہقہہ لگاتا ہما کی طرف بڑھا۔ ”صلہ صوفے پر چڑھی تیزی سے فریم آلتی پاتی مارے بیٹھی ہما پر لائی تو وہ یکدم چلا کر اپنی سیٹ سے اٹھی تھی۔“ امی.....“ اس کا رنگ فق تھا۔ اندر بیٹھی زرینہ خان کے چہرے پر بے ساختہ مسکراہٹ در آئی تھی۔ وہ کوئی انگریزی ہار فلم کا سین تھا جسے سنا کر وہ دوسری لڑکی کو خوف زدہ کر رہی تھی اور خاصی کامیاب بھی رہی تھی۔

اسے مزید تنگ کرنے کا ارادہ رکھتی صلہ ہنسی پر قابو نہ پاسکی اور ایک فلک شگاف قہقہہ بلند ہوا تھا۔

”آگے تو سنو ہیروئن صاحبہ کہ کیا ہوا۔“ وہ پیٹ پکڑے ہنستی ہوئی بمشکل بولی تھی۔ جبکہ ہما کے چہرے پر اب خوف کی بجائے غصہ تھا۔ وہ کچھ مارنے کو لینے بڑھی تھی کہ دفعتاً کامن روم کا دروازہ کھلا اور نسیم بادی، اعفان باری اور پروڈیوسر کے ہمراہ کمرے میں داخل ہوئے۔ صلہ کی ہنسی کو بریک لگ گئی۔ ہما تیر کی طرح سیدھی ہوئی۔ اعفان باری نے دلچسپی سے صوفے پر کھڑی صلہ کو دیکھا تھا۔ وہ ابھی سنبھل بھی نہ پائی تھی کہ کامن روم سے متصل میک اپ روم کا دروازہ کھلا اور باہر نکلنے والی خاتون پر نظر پڑتے وہ نیم والب لیے حق دیکھتی رہ گئی۔ زرینہ خان لائیو اس کے سامنے چلی آ رہی تھیں۔ ان کے چہرے پر جاندار مسکراہٹ تھی۔ ان دونوں پر ایک نظر ڈالتی وہ نووارد کی جانب متوجہ ہوئیں۔ ہما نے اس کا ہاتھ کھینچ کر نیچے اترنا

یاد کروایا۔ وہ جو منہ کھولے تک رہی تھی یکدم چونکی اور پہلے سے جمادو پیٹہ سہی کرتی فٹ نیچے اتری۔ اس کا جوتا کچھ فاصلے پر پڑا تھا مگر اس طرف جا کر وہ کسی کو متوجہ نہیں کرنا چاہتی تھی تو یونہی ننگے پاؤں کھڑی تھی۔

”ہم آپ ہی سے بات کرنے آرہے تھے۔“ پروڈیوسر کا ہمہ لہجہ معذرت خواہانہ تھا۔ جمیل حیرت سے ان کی مسکراہٹ ملاحظہ کر رہے تھے۔ عموماً ان کا موڈ جلد بحال نہیں ہوتا تھا۔

So shell we start۔ ”I guess everything is fine now“ نسیم ان کا موڈ بھانپتے خوشدلی سے نکل ہوئے۔
again ”وہ سب کمرے کے عین وسط میں کھڑے تھے۔ اور وہ دونوں صوفے کی سائیڈ پر ساکت کھڑی تھیں۔

Sure..But on my terms & conditions“ زرینہ باور کرانا نہ بھولیں وہ خفا نہیں تھیں مگر اصولوں پر ڈٹ جانا ان کی عادت تھی۔ ان کا اشارہ پروڈیوسر کی جانب تھا۔ آج صبح ہی ضرورت سے زیادہ سین فلمنگ کرانے کے اصرار پر ان کی پروڈیوسر سے ہلکی سی جھڑپ ہو گئی تھی۔ ”وائے ناٹ۔“ وہ بھی پروڈیوسر صاحب بلا جیل و جت مان گئے تھے۔ وہ پروڈکشن بورڈ سے بات کر کے ہی زرینہ کے پاس آئے تھے۔ ان کا اس پروجیکٹ پر ہونا لازم پر تھا یہ بات مارکیٹنگ والے بھی جانتے تھے۔ وہ اداکارہ ہونے کے ساتھ منجھی ہوئی ہدایتکار بھی تھیں اور اب تک ڈائریکشن میں بھی خاصا نام کما چکی تھیں۔ انہوں نے مسکراتے چلنے کا اشارہ کیا۔ باری باری وہ تینوں باہر نکل گئے۔ زرینہ جاتے جاتے چوکھٹ پر رکیں اور یکنخت مڑیں جیسے کچھ یاد آیا ہو۔ وہ دونوں ابھی تک ہونق بنی کھڑی تھیں۔

”بائی داوے..... گڈ نریشن۔“ وہ صلہ کو دیکھتی مسکراتی باہر نکل گئیں۔ ان دونوں کا جیسے سکتہ ٹوٹا تھا۔
”ہائے اللہ..... یہ واقعی زرینہ خان تھیں؟ ان کے جاتے ہی ہما پتھری بولی۔ صلہ بھی بے یقین سی تھی۔“ ہما کی بچی تمہیں پتا تھا زرینہ خان، نعیم بادنی کی کوڈائریکٹر ہیں اس پروجیکٹ میں؟“ صلہ نے اسے چپت رسید کرتے پوچھا۔

”مجھے کہاں پتہ تھا میں تو آؤٹ ڈور شوٹ پر ہوں جب سے کراچی آئی ہوں۔“ وہ بولی۔ تو صلہ سر پکڑ کر رہ گئی۔
”یعنی حد ہو گئی۔ سکرپٹ پڑھنے کی تو تمہیں توفیق نہیں ہوئی۔ یہ بھی معلوم نہ ہو سکا کہ دوسرا ڈائریکٹر کون ہے۔“
”انکل بتا تو رہے تھے میں نے غور سے کبھی ان کی بات ہی نہیں سنی۔ اکیچو نیلی اتنے دنوں سے کھانا ڈھنگ سے نہیں کھایا تھا نہ تو دماغ ہی بند ہو گیا تھا۔ جیسے“ وہ معصومیت سے بولی۔ صلہ سر جھٹک کر رہ گئی۔

”کیا یار کم از کم ان کے سامنے تو میری بوگی حرکتوں کا پول نہ کھلتا۔“ وہ منہ پھلا کر بیٹھ گئی۔
”کیوں جناب ان کے سامنے بڑا فلاسفر بن کے آنا تھا یا گوٹے کناری والا سوٹ پہننا تھا انہیں امپریس کرنے کو۔“ وہ اس کے حد درجہ سادہ حلیے پر چوٹ کرتی بولی۔

”کیا پتہ ان کو پسند ہوتے گوٹے کناری والے سوٹ وہی پہن لیتی۔“ اس کے چہرے پر بلا کا افسوس تھا۔ ہما گویا اس کی عقل پر ماتم کرتی سر ہلا کر رہ گئی۔

وہ سوکراٹھا تو سر بے حد بھاری ہو رہا تھا۔ آنکھیں اس قدر بوجھل تھیں جیسے بھاری پتھر پڑے ہوں۔ رات کی بے تحاشہ سے نوشی کے اثرات تھے۔ اس کا ملازم سائیڈ ٹیبل پر سوڈا واٹر رکھ گیا تھا۔ وہ چکراتے سر کو سنبھالتا واش روم میں گھس گیا۔ شاور لے کر وہ قدرے بہتر محسوس کر رہا تھا۔ سائیڈ ٹیبل پر سے گلاس اٹھاتے سیل فون کو دیکھتا رکھا۔ 10 مسڈ کالز جن میں سے آٹھ زارا کی تھیں اور دو اس کی سابقہ بیوی کی۔ اس کا حلق تک کڑوا ہو گیا۔ اس کی سابقہ بیوی ہادیہ احمد کی دھمکیاں روز بروز بڑھتی جا رہی تھیں۔ وہ مزید سکیئنڈل افورڈ نہیں کر سکتا تھا۔ سوزار کے میسجز اور کالز کا کوئی جواب دیے بغیر فون پلنگ پر اچھا ل دیا۔ وہ اب اکثر ہوٹلز کے کمروں میں ملاقات کیا کرتے تھے۔ بالاج علی شاہ کے لیے ایسی ملاقاتیں اور بلاوے گناہ تھے مگر شاہو کے لیے یہ معمول کی سی بات تھی۔ وقت انسان کو حیرت انگیز طور پر بدل دیتا ہے اور انسان کو خبر تک نہیں ہوتی اور نہ ہی احساس ہوتا ہے۔ وہ باہر کمرے سے ملحق بالکونی میں چلا آیا۔ سوڈا کا گلاس لیوں سے لگاتے وہ دور خلاؤں میں گھور رہا تھا۔ تمام یونٹ میں صرف اس کا ذاتی ملازم تھا۔ ورنہ ساحل سمندر سے کچھ فاصلے پر بنایہ جو صورت ریٹ ہاؤس خش قسمتی سے انہیں خالی مل گیا تھا اور آج کل اس پر وجیکٹ سے متعلق لوگوں کی آماجگاہ تھا۔ سب کے لیے کامن ملازم اور باورچی تھا۔ اور سب کا کامن کچن بھی ایک ہی تھا۔ ہلکی سی آہٹ پر اس نے خفیف سی گردن موڑی۔ صلہ بالکونی میں جانے کب سے کھڑی تھی۔ وہ بالکونی ہمارے کمرے سے بھی ملحق تھی۔

”ایکسیوزی.....“ صلہ یکدم اس کی جانب بڑھی۔ وہ چونکا۔ ان دونوں کی براہ راست کبھی بھی بے تکلف گفتگو نہیں ہوئی تھی اور نہ ہی دونوں ایک دوسرے کو بلانا پسند کرتے تھے۔ صلہ بے عزتی کے خوف کے مارے اور شاہو تو ویسے بھی لا تعلق ہی رہتا تھا۔

”وہ زرینہ خان ہیں نا؟“ اس نے دور ساحل پر اکیلی کھڑی خاتون کی طرف اشارہ کر کے اس سے تصدیق چاہی۔ بالاج نے سپاٹ سی نظر اس جانب ڈالی کندھوں سے بالشت بھر نیچے آتے گھنے بھورے بال، وہ خاتون ان کی جانب پشت کیے کھڑی تھیں۔ وہ خاتون کہیں سے بھی زرینہ خان نہیں لگتی تھیں۔ ”کسی اچھے سے ڈاکٹر سے اپنی نظروں کا علاج کروائیں۔ یقیناً افاقہ ہوگا۔“ وہ طنزیہ بولا۔

”آپ کی آنکھوں میں تو جیسے دور بین فٹ ہے نا۔“ وہ تنک کر بولی تھی۔ اس نے برہمی سے اسے دیکھا۔ وہ ابھی بھی بے نیاز آنکھیں سکڑے وہیں دیکھ رہی تھی۔ وہ اسے کچھ سناتا اس سے پہلے وہ جیسے اس پر لعنت بھیجتی جلدی سے مڑی اور تقریباً بھاگتے ہوئے ریٹ ہاؤس سے نکلی کچھ ہی دیر میں وہ اس کے سامنے نیچے کھڑی تھی۔ اس خاتون سے قدرے فاصلے پر کھڑی جانے کیا سوچ رہی تھی۔ وہ یہاں سے بھی اس کی کنفیوژ حالت بھانپ سکتا تھا۔

”زرد رنگ کی لاٹک اے لائن قمیص، ہم رنگ ٹراؤڈر میں ملبوس دوپٹہ شانوں پر پھیلائے دانتوں سے ناخن کترتی وہیں دیکھ رہی تھی۔ وہ اول جلول سی لڑکی اسے خواہ مخواہ ہی بری لگتی تھی۔ نسیم بادنی کے ہر پروجیکٹ میں ہوتی تھی۔ مگر ہمیشہ بلا واسطہ ہدایات اس تک پہنچاتی تھی۔ اس نے غور کیا تو ٹھنک گیا۔ وہ واقعی زرینہ خان تھیں۔ اسے تعجب ہوا تھا وہ کبھی اکیلی نہیں نکلتی تھیں۔ دفعہ اس کا سیل فون بجوا وہ ایک اچشتی نظر ان پر ڈال اندر چل دیا۔

☆.....

صلہ جی کڑا کر کے ان کی جانب بڑھی۔ ابھی مخاطب کرنے کا سوچ ہی رہی کہ ان کے اچانک مڑنے پر وہ ہلکے سے چلا اٹھی۔ ”امی.....“
 زرینہ متعجب ہوئیں۔ ”کیا ہوا۔“ وہ دو قدم پیچھے ہٹتی بے ساختہ دل تھام کر رہ گئی۔ اب وہ کیا بتاتی کہ ان کی گود میں موجود ان کی اس محبوب ترین مخلوق
 سے وہ کس قدر ڈرتی تھی۔

”ارے یہ کافیا نہیں ہے۔“ اسکا ڈر بھانپتے وہ شگفتگی سے بولیں۔ اور اس جیک نماکتے کا سر سہلانے لگیں۔

”کائے نہ کائے۔ کتا تو آئی مین ڈوگی تو ڈوگی ہوتا ہے۔“ وہ خوفناک تاثرات لیے اسے گھورتے جیک کو دیکھتے بولی۔ زرینہ مسکرائیں
 صلہ ٹرانس کی سی کیفیت میں انہیں دیکھے گئی۔ دنیا ان کی مسکراہٹ کی دیوانی کیوں تھی یہ اسے آج پتہ چلا تھا۔ انہوں نے جیک سے کچھ کہتے گود سے
 اتار اتار وہ ایک سمت میں دوڑتا چلا گیا۔

”اگر یہ بھاگ گیا تو؟“ صلہ نے یونہی پوچھ لیا۔ اپنے بڑے سوچے سمجھے سوالات تو اسے یکسر بھول گئے تھے۔ زرینہ کو جانوروں سے بے
 حد محبت تھی خصوصاً کتے اور بلیوں سے۔

”نہیں بھاگے گا۔ ذرا سی محبت انہیں زندگی بھر کے لیے خرید لیتی ہے۔“ وہ پر محبت لہجے میں بولیں۔

”محبت کی وجہ سے یا فلسفہ رزق کی وجہ سے؟“ صلہ کے منہ سے بے ساختہ نکلا تھا۔ ان کے چہرے پر ایک رنگ آ کر گزر گیا۔ ”یہ کیا بات
 ہوئی؟“

”آپ دو دن انہیں کھانا نہ دیں پھر دیکھئے گا۔“ صلہ نے اپنی طرف سے بڑی عقل کی بات کی تھی۔

”تمہیں شاید جانوروں کی سائیکس کا نہیں پتا اس لیے ایسا کہہ رہی ہو۔“ وہ نفی میں سر ہلاتی چہل قدمی کے سے انداز میں آگے بڑھ گئیں۔
 ”جو بھی ہو۔ لیکن جانور انسان کی جگہ تو نہیں لے سکتے نا۔ وہ آپ کو انسانوں سے بڑھ کر محبت دے سکتے ہیں مگر آپ بیمار ہو جائیں تو کیا
 اولاد کی طرح آپ کی خدمت کر سکتے ہیں؟“ وہ خواہ مخواہ بات بڑھا رہی تھی۔

”آج کل کی اولاد کے پاس اتنا وقت کہاں؟“ ان کے لہجے میں عجب کرب تھا۔ وہ رکیں۔ ”کوئی کام تھا؟“

”کام.....؟“ صلہ یاد کرنے کو رکی۔ ”نہیں کام تو کوئی نہیں تھا۔“ وہ سمندر کی جانب رخ موڑ کر کھڑی تھیں۔ وہ اسے کافی دنوں سے
 سیٹ پر دیکھ رہی تھیں۔ مگر کبھی اس سے بات نہیں ہوئی تھی وہ جانتی تھیں کہ وہ یونٹ کا حصہ نہیں ہے پھر بھی ہر روز سیٹ پر کہیں نہ کہیں موجود ہوتی
 تھی۔ ”ایک بات پوچھوں آپ سے؟“ وہ ہچکچائی۔ زرینہ نے ہنوز سامنے دیکھتے سر کو ہلکی سی جنبش دی۔

”کہتے ہیں کہ جانوروں سے محبت کرنے والے عموماً انسانوں سے خفا ہوتے ہیں۔“ صلہ پر اعتمادی تھی گویا اس فلسفے پر اٹل یقین رکھتی ہو۔
 زرینہ کی صبح پیشانی پر بل پڑ گئے۔ دنیا جنکی ملنساری اور خوش مزاجی کی مثال دیتی تھی، ساتھ کھڑی لڑکی انہیں آدم بیزار کہہ رہی تھی۔

”کہنے والے ہر بار ٹھیک کہیں ضروری تو نہیں۔“ وہ ساٹ سے لہجے میں بولی تھیں۔

”آپ بہت اچھی اداکارہ ہیں۔ آپ کو ایکٹنگ نہیں چھوڑنی چاہیے تھی۔“ وہ پر سوچ لگا ہوں سے انہیں تک رہی تھی۔ زرینہ نا سمجھی کے عالم

میں اسے دیکھ کر رہ گئیں۔ وہ اس لڑکی کی بات کا مقصد نہیں سمجھ پائی تھیں انہیں زیادہ تر دو طرح کے لوگ Publically approach کرتے تھے۔ ایک ان کے پرستار اور دوسرے جرنلسٹ اور انہیں انٹرویوز وغیرہ سے سخت کوفت ہوتی تھی۔ ”اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ میں آپ کی ڈائریکشن کی فین نہیں ہوں۔“ اس نے جلدی سے تصحیح کی۔ ”اچھو کیلی وہ فنانٹیسزم (fanaticism) والی Fan نہیں ہوں ناں اسی لیے چاہتی ہوں کہ آپ اسکرین پر بھی نظر آئیں۔“ زرینہ بے اختیار اس کی جانب مڑیں۔ ”اچھا تو پھر کس قسم کی فین ہیں آپ؟“ وہ مظلوظ ہوئیں۔

”اصل میں فنانٹیسزم والے فین تو بڑے کڑ قسم کے ہوتے ہیں۔ اگر آپ موٹی ہو جائیں، آپ کے بال گر جائیں، یا آپ کا رنگ فیئر نہ رہے میں تب بھی آپ کی فین رہوں گی۔“ وہ ٹھکر سے بولی تھی۔ وہ بے اختیار ہنس دیں۔ ”اچھا تو پھر یہ ناٹ فنانٹیسزم والی فین کیا چاہتی ہے؟“ وہ اپنے ازلی شفقت بھرے انداز میں بولیں۔ کسی اشتہار کے لیے انہوں نے بھورے رنگ کا ڈائی کروایا تھا۔ پچاس سال کی عمر میں بھی ان کے چہرے پر اس رنگ کی مناسبت سے کڑنگلی کے بجائے بہت نرمی تھی۔

”چاہتی تو خیر میں بہت کچھ ہوں۔ اگر بتانے بیٹھی تو رات ہو جائے گی۔“ وہ شوخ ہوئی تو وہ مسکراتے آگے بڑھ گئیں۔ وہ دونوں ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ اس نے تو خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ وہ کبھی یوں ان کے ساتھ ساحل سمندر پر چہل قدمی کر سکے گی۔

”آپ جیسی ڈراموں میں روایت شکن کردار ادا کرتی تھیں ویسے ہی حقیقت میں بھی ہیں۔ ڈٹ جانے والی بہت ضدی اور باغی۔ آپ کی شادی جن حالات میں ہوئی اور جس طریقے سے وقوع پذیر ہوئی وہ الگ کا رنامہ تھا۔“ وہ مسکراہٹ دباتے بولی تھی جبکہ زرینہ کا تہقہہ فضا میں گونج اٹھا تھا۔ آج کیا یاد کروایا تھا اس نے۔ ان کے گھر والے اس شادی کے لیے قطعی راضی نہیں تھے۔ کیونکہ جمیل اختر پہلے کرچن تھے بعد میں انہوں نے زرینہ سے شادی کی غرض سے اسلام قبول کیا تھا۔ 80 کی دہائی میں جب جہیز اور بری کے بغیر شادی کا تصور محال تھا۔ اس وقت میں انہوں نے یہ روایت توڑ ڈالی تھی۔ نہ وہ کچھ لے کر گئیں اور نہ ہی کچھ لیا۔ حالانکہ دونوں خاندان کو ان دونوں نے منالیا تھا۔ وہ تو چھسٹری کی طرح جج سنور کر بیٹھنے کی بجائے کا مدرٹیس سے فراق اور چوڑی دار پا جامہ زیب تن کیے سب مہمانوں کو ریسو کر رہی تھیں۔ جمیل اختر نے سادہ شلوار قمیص پر سیاہ واسکٹ پہنے ان کا بھرپور ساتھ دیا تھا۔

”ہاں اس وقت تو جنون سوار تھا کچھ کر دکھانے کا۔“ وہ یاد کر کے مسکرائیں۔ انہیں اس کا یہ حوالہ دینا اچھا لگا تھا ورنہ زیادہ تر پرستار ان کی مسکراہٹ یا ان کے دو شہرہ آفاق سیریلز کا حوالہ دیتے تھے۔

”خیر جنونی تو آپ اب بھی ہیں۔“ وہ انہیں دیکھ کر مسکرائی۔ ”اس زمانے رائٹرز بھی شاید آپ کی حقیقی زندگی سے خاصے متاثر تھے۔ آپ کو یاد ہے آپ کا ایک ڈرامہ تھا پڑوسی کے نام سے۔“ اس نے ان سے تصدیق چاہی۔ وہ شاید یاد کرنے کی کوشش کر رہی تھیں۔

”ایسا لگتا تھا رائٹرز نے آپ کی اصل زندگی کی کہانی اسکرین پر دکھادی۔ شادی والا سیم سین تھا۔ اور سب سے بڑھ کر وہ یتیم خانے والے منظر جہاں آپ چھ ماہ کی بچی کو حسرت بھری نگاہوں سے دیکھ رہی ہوتی ہیں۔ آپ کی نظروں میں وہ جوڑپ تھی وہ ایکٹنگ تو ہو ہی نہیں سکتی۔ یوں لگتا تھا کہ.....“ دفعتاً اس کی نظر ان کے چہرے پر پڑی وہ انتہائی سنجیدہ تھیں۔ یکنخت اسے اپنی شدید غلطی کا احساس ہوا تھا۔

”آتم سو سوری۔ آپ کو شائد برا لگا۔“ وہ حقیقتاً شرمندہ تھی۔

”اٹس اوکے.....“ وہ نارمل سے انداز میں بولی تھیں پھر ایکسکوز کرتی وہاں سے چل دیں۔ صلہ لب کچلتی دکھ سے انہیں جاتا دیکھتی رہی۔ وہ ڈرامہ ان کی شادی کے پانچ سال بعد آن ایئر ہوا تھا۔

.....☆.....

”اسی لیے کہتے ہیں ضرورت سے زیادہ چالاکی بھی لے ڈالتی ہے۔“ ہما نے اس کی داستان امیر حمزہ سننے کے بعد تاسف سے سر ہلایا تھا۔

”یار میں نے تو ویسے ہی گیس کیا تھا مجھے کیا پتہ تھا کہ.....“

”حد کرتی ہو تم بھی۔ تمہیں پتا تو ہے کہ ان کے ہاں بچے نہیں ہیں۔ خوش مزاجی کا مطلب یہ تو نہیں ہے کہ انہیں یہ کی محسوس نہیں ہوتی۔“ وہ رکی۔

”اور تم ہیں کیا ضرورت پڑی تھی اتنا فری ہونے کی۔ اتنے دنوں سے تم آرہی ہو۔ انہوں نے تمہاری طرف دیکھا تک نہیں حالانکہ اس دن تمہاری ساری نریشن بھی سنی تھی انہوں نے۔“ وہ چہرے پر آتے بالوں کو پیچھے ہٹاتی بولی۔

”اسی کا تو دکھ ہے.....“

”کیا مطلب؟“ ہما حیران ہوئی۔

”سٹو پڈ وہ ایک انگلش فلم کا سین تھا۔ میرا لکھا نہیں تھا۔ کیا سوچتی ہوں گی وہ۔ خود کو رائٹر کہتی ہے اور چوری کیا سین سنارہی ہے۔“ وہ براسا منہ بناتے بولی۔

”تم انگریزی فلموں سے کہانی چوری کر کے معصوم لڑکیوں کو بے وقوف بناتی ہو۔ تمہاری ڈائجسٹ کی فیئر کو تو میں بتاتی ہوں۔“ اس نے منہ پر ہاتھ پھیرتے دھمکی دی۔

”انسپائریشن بھی کوئی چیز ہوتی ہے یار۔ اور انگریزی فلموں کی سٹوری اتنی بھی اچھی نہیں ہوتی کہ سیم نو سیم کاپی کی جائے۔“ اس نے نارمل سے انداز میں بات سمیٹی۔ وہ دونوں لان میں بیٹھی تھیں جہاں اگلے سین کے لیے سیٹ تیار کیا گیا تھا۔ رزینہ، نسیم بادیانی اور پروڈیوسر سے کوئی بات کر رہی تھی۔ ان کا رخ ان دونوں کی جانب تھا جبکہ نسیم بادیانی اور پروڈیوسر کی انکی جانب پشت تھی۔ رزینہ کے چہرے پر کہیں خفگی کا شائبہ تک نہ تھا۔ گفتگو خوشگوار ماحول میں ہو رہی تھی۔ ان کی یہی خوبی تھی وہ مذاق مذاق میں ہی اپنا کام نکلوا لیا کرتی تھیں۔

”تو کیا وہ سارا چوری شدہ سین تم اپنی کہانی میں لکھو گی۔“ ہما کی سوئی ابھی بھی وہیں انکی تھی۔

”پاگل سمجھا ہے کیا۔ وہ تو ایویس بیٹھے بیٹھے شرارت سوچتی تھی۔ پتا ہوتا کہ وہ اندر بیٹھی سن رہی ہیں تو کم از کم اور بجٹل نریشن سنا دیتی۔“

اس نے افسوس سے ہاتھ ملے۔ ”خیر اب کیا ہو سکتا ہے۔ ویسے بھی ان ستاروں کی تو اپنی ان سکیورٹیز ہی بہت ہوتی ہیں یہ کسی کے نہیں بنتے۔“

”جی نہیں وہ ایسی نہیں ہیں۔“ وہ قطعیت سے بولی۔ دزدیدہ نظروں سے وہ رزینہ کو دیکھ رہی تھی۔ پروڈیوسر صاحب اثبات میں سر ہلارہے

تھے نسیم بادیانی کا رخ بھی صلہ ہما کی جانب تھا۔ یعنی وہ بھی پارٹی بدل کر رزینہ کے ساتھ ہو گئے تھے۔ پھر تینوں مسکراتے وہاں سے چل پڑے۔ ہما اٹھ

گئی اس کا ورکشاپ کا ٹائم تھا۔ نسیم نیو کمرز کو بطور خاص ریہرسل کروایا کرتے تھے۔ صلہ سینے پر ہاتھ باندھے پرسوج نگاہوں سے ان تینوں کو جاتا دیکھتی رہی۔ وہ قدرے الگ تھلگ گوشے میں پڑی چیئر پر بیٹھی تھی۔ دفعتاً کوئی اس سے چند انچ کے فاصلے پر بڑی چیئر پر آ بیٹھا۔ وہ چونکی۔

”آپ کیا ہر وقت خیالوں میں رہتی ہیں یا آج کل کوئی خاص وجہ ہے۔“ اعفان باری دلچسپی سے اسے دیکھتا بولا تھا۔ وہ سخت کبیدہ خاطر تھی۔ اس کی بات پر دھیان تک دینے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔

”ویسے یہ دونوں ساتھ میں اچھے لگتے ہیں..... نہیں؟“ اس نے بالاج اور ہما کی طرف اشارہ کیا۔ وہ دونوں ہاتھ میں پرچے تھامے نسیم صاحب کو بغور سن رہے تھے۔ ٹخنوں کو چھوتی سرمئی فراک میں اس کا دراز قد بہت نمایاں تھا۔ لمبے سیدھے بال پشت پر بکھرائے وہ نظر لگ جانے کی حد تک حسین لگ رہی تھی۔ جبکہ بالاج بلیک جینز پر سرمئی کرتا پہنے تھا۔ آستین کہنیوں تک فولڈ کیے بالوں کا خوبصورت سٹائل بنائے حسب معمول جاذب نظر لگ رہا تھا۔

”ویسے آپ ہما کے علاوہ کسی سے بات کرنا پسند نہیں کرتیں؟“ اس کے سوال پر وہ بمشکل بیزاری چھپا پائی۔

”انسان اپنی پسند کے لوگوں سے ہی بات کرنا پسند کرتا ہے۔.....“ VTR پر مصروف زریہ نے کود دیکھتے اس نے سپاٹ سے انداز میں کہا۔

اعفان اس صاف گوئی پر حیران ہوا۔ ”ریلی.....؟ اچھا آپ کو تو کھلی سی شرٹ اور تنگ سی جینز پہنے لڑکے پسند ہیں۔ وہ گویا اس کی ناپسندیدگی سے خطا اٹھا رہا تھا۔ صلہ نے سوالیہ نظروں سے ناگواری اسے دیکھا۔

”آپ کی میسٹ فرینڈ، نادیہ کو بڑے زور و شور سے بتا رہی تھی۔ اتفاقاً میں نے سن لیا تھا۔“ اس نے وضاحت کی۔

”تو آپ یہ بھی کرتے ہیں۔“ اس کے لمبے میں طنز کی گہری کاٹ تھی۔ اعفان خجالت سے سر کھاتے کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

”او کے جی لیس سٹارٹ۔“ زریہ کے مائیک میں بولتے ہی سناٹا چھا گیا۔ دفعتاً اس کا سیل فون بجا۔ صلہ نے قدرے چونک کر اسے دیکھا تھا۔ وہ سیٹ سے کافی دور تھے پھر بھی اعفان نے فوراً فون کی آواز بند کی تھی۔ ایک نظر اس پر ڈالتے واپس ان دونوں کو دیکھنے لگی۔ بالاج ہما کے عقب میں کھڑا کچھ کہہ رہا تھا۔ وہ ان کی آوازیں ٹھیک سے سن نہیں پارہے تھے۔ ہما جو کہ خفا تاثرات لیے کھڑی تھی یکدم پلٹی اور اس کی نظروں میں جھانکتی ٹھنک کر رکی۔ ”لگتا ہے ڈائلاگ بھول گئی۔“ کافی دیر اس کے نہ بولنے پر اعفان نے سرگوشی کی۔ نسیم صاحب دوبارہ ان کے پاس گئے۔ ہما کو سمجھا بھجا کروہ گئے تو بالاج نے اسے تسلی دی اور شاید کوئی ٹپ بھی۔ صلہ سن نہیں پائی۔ بہر کیف ٹیک 2 لیا گیا۔ صلہ دل ہی دل میں ہما کے لیے دعا کرتی ایک ٹک انہیں دیکھے گی۔ بالاج لاکھ اکھڑ مزاج سہی مگر کام کے وقت وہ کوئی گز کے ساتھ بہت کو آپریٹو تھا۔ اکثر فیمیل آرٹسٹ یہیں سے اس پر فدا ہوتی تھیں اور پھر اس کے لاتعداد افیئرز میں وسیع تر اضافے کا باعث بنتی تھیں۔ وہ بھی کسی کا بڑھا ہاتھ جھٹکتا نہیں تھا۔ بلکہ صاف ٹائم پاس کہہ کر ان کو استعمال کرتا اور پھینک دیتا۔ اس کی سانولی رنگت گرومنگ کے باعث قدرے گندی ہو گئی تھی۔ مناسب قد، ٹیکھے نقوش اور گہری سیاہ آنکھوں میں ہلکورے لیتا عجیب پر اسرار سا تاثر۔ اس کی نسبت اعفان باری زیادہ پینڈ سم تھا۔ گوکہ بالاج کی انتہائی مہنگی اور قیمتی خوش لباسی اسے سب میں ممتاز کرتی تھی مگر اس کی شخصیت میں عجیب سا سحر تھا جو مقابل کو جکڑ لیتا تھا۔ وہ سحر زدہ کردینے والی اہلیت اعفان کے پاس نہیں تھی۔

اعفان کا پھر سے فون بجا تھا۔ نمبر دیکھ کر وہ جھجھلا گیا۔ اس کا نمبر کسی فین کے ہاتھ لگ گیا تھا اور وقت بے وقت اس کے فون نے اعفان کو زچ کر کے رکھ دیا تھا۔ وہ اٹھ کر وہاں سے چل دیا۔ جبکہ صلہ گھاس پر اکٹھے چلتے ہمارا بالاج کو دیکھ رہی تھی۔ دوسری لڑکیوں کی نسبت ہمارے ساتھ دھیمے انداز میں بات کرتا تھا جبکہ زارا کو کام کے دوران بالکل انور کر دیتا تھا۔ سین ختم ہونے تک صلہ کا ذہن کہیں اٹک سا گیا تھا۔

.....☆.....

وہ ساحل سمندر پر قدرے پرسکون گوشے میں بنے بیچ پر آ بیٹھی۔ اتفاقاً موسم بھی سہانا تھا اور اس کا موڈ بھی۔ وہ آج پکا تہیہ کر کے آئی تھی کچھ نہ کچھ لکھ کر ہی جائے گی۔ پچھلے دنوں زریہ کو دیکھنے خواہ مخواہ سیٹ پر چلی جاتی تھی مگر دوبارہ انہیں مخاطب کرنے کی ہمت پھر بھی نہیں کر پاتی تھی۔ موسم خوشگوار ہونے کے باعث لوگوں کا تانتا بندھا تھا۔ کچھ لوگ بچوں کے ساتھ کسی کھیل میں مشغول تھے اور کچھ چہل قدمی کر رہے تھے۔ سامنے کچھ کرکٹ کھیلتے، لڑتے جھگڑتے بچوں کو دیکھ کر وہ بے ساختہ مسکرائی۔ وہ بھی ایسے ہی چیونگ کر کے کزنز سے خوب لڑتی تھی۔ اور شیری ڈھٹائی سے اس کی سائیڈ لیتا سب کو لٹاڑ کر رکھ دیتا اس کی بائیں جانب بیچ پر اسکی ملگجے سے سبز رنگ کی فائل دھری تھی۔ جو کہ کثرت استعمال کے باعث اصلی رنگت کھو بیٹھی تھی۔ صفحات کا پلندہ جن میں کچھ مڑے تڑے کنارے اور چند نئے ورق کے کونے اپنی بہار دکھا رہے تھے۔ سینے پہ بازو لپیٹے اور گردن نظر دوڑا رہی تھی مگر اس کا دماغ گہری سوچ میں گم تھا۔ دفعۃً اس کے قریب سے ایک بچہ گزر رہا تھا۔ اس نے بے اختیار اس جانب دیکھا تو اس کی سرسری نظر نے لوٹنے سے انکار کر دیا۔ وہ بھاگتا جا رہا تھا اس نے باقی بچوں کی تلاش میں نظر دوڑائی کہ شاید کوئی کھیل کھیل رہے ہوں۔ مگر دور تک کوئی نہیں تھا۔ تبھی دور سے آتی آواز نے اسے چونکا دیا۔ ”آورش بابا رکھے۔ آورش بابا۔“ ایک ضعیف العمر آدمی کا پتے اسے پکارتے آرہے تھے۔ اس نے بچے کی جانب دیکھا تو ٹھٹک گئی۔ وہ شاید توازن کھونے کے باعث گرا تھا۔ وہ نامحسوس انداز میں اس کی جانب لپکی۔ وہ بزرگ خاصے فاصلے پر تھے۔ اس نے بازوؤں سے تھام کر اسے اٹھایا ”آپ ٹھیک ہو بچے؟“ اس نے متفکر سے انداز میں پوچھا۔

آدمی آستین کی ٹی شرٹ بمع ہم رنگ نیکر پہنے لگ بھگ چار سال کا وہ خوبصورت سا بچہ خفا خفا سا لگ رہا تھا۔ اس نے اس کے کپڑے جھاڑے تو نظر اس کے ننھے جوگرز کی جانب پھسل گئی۔ ان کے تسمے کھلے تھے اور غالباً وہ انہی کی وجہ سے گرا تھا۔ وہ تیز ہوا سے اڑتے بال کانوں سے پیچھے اڑتے اس کے تسمے باندھنے لگی۔

”بی بی جی رہنے دیں۔ میں کر دوں گا۔ بابا چوٹ تو نہیں لگی۔“ کیم شیم سے بابا جی بچے کے کندھے پر ہاتھ رکھے پوچھ رہے تھے۔ بچے نے درستی سے ان کا ہاتھ جھٹکا اور وہاں سے چند گز فاصلے پر ریت پر جا بیٹھا۔ اکڑوں بیٹھی صلہ نے بے بس سے کھڑے بابا پر نظر ڈالی۔ کچھ سوچ کر وہ منہ پھلوائے بچے کے ساتھ جا بیٹھی۔ وہ ناراض ناراض سا بچہ غصے میں اتنا کیوٹ لگ رہا تھا جب خوش ہوتا ہوگا تو کیسا لگتا ہوگا۔ وہ بے اختیار سوچ کر رہ گئی۔ ”کیا بات ہے بابا۔ یہ کیوٹ سے شہزادے ناراض کیوں ہیں؟“ اس نے بچے کی طرف رخ کیے بزرگ ملازم سے پوچھا تھا۔ وہ کچھ ہچکچائے۔ ”وہ جی بیگم صاحب ملک سے باہر گئی ہیں اور یہ ان سے ملنے کی ضد کر رہے ہیں۔“

”نہیں..... جھوٹ بول رہے ہیں یہ۔ سب جھوٹ بولتے ہیں میرے ساتھ۔ کوئی مجھے ان کے پاس نہیں لے تے جاتا۔“ وہ رندھی آواز میں غصے سے بولا تھا۔

”کیسے ملائیں۔ وہ تو یہاں ہیں نہیں اور صاحب.....“

”وہ یہیں ہیں۔ میں نے خود انہیں دیکھا تھا سکول تے باہر۔“ اس نے پھر بات کاٹی تھی۔

”ان کے ساتھ ایک اور بچہ بھی تھا۔“ کہتے کہتے اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ جنہیں اس نے فوراً اپنے ننھے ہاتھوں سے صاف کیا

تھا۔ صلہ جو تھیری ان دونوں کی باتیں سن رہی تھی قدرے چونک سی گئی۔ وہ حیران تھی کہ اتنی عمر میں آنسو خود سے پونچھ لینا کہاں سے سیکھا تھا اس نے۔

”وہ جی..... بابا کو وہم ہوا ہے۔ وہ تو یہاں ہیں ہی نہیں ورنہ صاحب خود ہی ملوادیتے۔“ اب کے ملازم کا لہجہ کمزور سا تھا۔ صلہ ہنوز گہری سوچ

میں ڈوبی تھی۔ ”مجھے پتا ہے پاپا کی ان سے کئی ہے۔ وہ ان کے پاس نہیں لے تے جائیں گے مجھے۔“ وہ زور سے چلایا تھا کہ اب کوئی بہانہ نہیں چلے گا۔

”بھئی ہم تو ضرور ملیں گے مئی سے۔ یہ کونسا مشکل کام ہے۔ ڈھونڈ نکالیں گے کہیں سے بھی۔ وہ آواز میں جوش بھرتی بولی تھی۔ بچے کی

متورم آنکھوں میں حیرانگی دُر آئی۔ جو بابا وہ مسکرا دی۔

”اپنا نام نہیں بتائیں گے؟“ چند لمحے کی بے یقینی سی خاموشی کے بعد صلہ کا بڑھا ہاتھ اس نے تھام لیا۔ ”آدرش.....“ وہ بچہ اپنی عمر کے

بچوں سے خاصا مختلف تھا۔ صلہ کو محسوس ہو گیا تھا کہ وہ کینڈیز وغیرہ کے لالچ میں نہیں آئے گا۔

”بونڈ..... جیمس بونڈ“ اس کے پوچھنے پر صلہ نے مسکراہٹ دباتے تعارف کروایا۔ ”وہ تو لکا ہوتا ہے آپ تو لکی (لڑکی) ہو۔“ وہ حیران ہوا

تو صلہ ہنس دی۔ ”لکا لکی کچھ نہیں ہوتا۔ جیمس بونڈ ہو وہ ہوتا ہے کہ جن بچوں کی مئی نہیں ملتی نا وہ اسے ڈھونڈ لاتا ہے۔“ اس کی بات پر کھل اٹھا تھا۔

”ویسے آپ مجھے صلہ بھی کہہ سکتے ہیں۔“ وہ اس کا ننھا سا ہاتھ نرمی سے چھوڑتی بولی۔

”شیلہ.....“ آدرش نے اس کا نام زیر لب دوہرایا تو وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔ ایک اور نام بگاڑنے والا مل گیا تھا۔

”آپ مجھے میری ماما سے ملواؤ گی نا۔“ بچے کے چہرے پر خوبصورت سی چمک تھی۔ صلہ چند لمحے سوچ کر رہ گئی۔ وہ اس کا دل توڑنا نہیں

چاہتی تھی مگر وہ اس کی مئی ڈھونڈ وہم میں پڑنا بھی نہیں چاہتی تھی۔ اس نے ملازم بابا کی جانب دیکھا۔ ان کے ہاتھ میں ادھ کھایا سینڈویچ تھا۔

”بالکل ڈھونڈیں گے۔ لیکن پہلے کھانا نہ کھالیں؟ سچ میں بہت بھوک لگی ہے۔“ وہ چہرے پر مسکینیت طاری کرتی بولی تھی۔ وہ ہلکے سے سر

ہلاتا اٹھ کھڑا ہوا۔ سامنے کھڑے فرید بابا متذبذب سے کچھ کہتے کہتے رُک گئے تھے۔ ان کے چھوٹے سرکار بڑے عرصے بعد کھل کر مسکرا رہے تھے۔ وہ

ان کے ساتھ قریبی فاسٹ فوڈ ریستورنٹ چلی آئی۔ کھانے کے دوران وہ چھوٹے چھوٹے سوال پوچھتی اس کا دھیان ہٹانے کی بھرپور کوشش کر رہی تھی۔

وہ زیادہ کھل کر بات نہیں کرتا تھا اس کے باوجود بھی وہ اس کی باتوں کا اپنے مخصوص دھیے انداز میں جواب دے رہا تھا۔ عام بچوں کی طرح مسلسل وہ ضد

کر کے اسے زچ نہیں کر رہا تھا۔ کھانا ختم کرتے اس نے ان دونوں سے اجازت چاہی۔ آدرش دھیرے سے اٹھ کر اس کے ساتھ باہر آیا۔

”ہم پھر کب ملیں گے؟“ اس نے آس بھری نظروں سے اسے دیکھا تو صلہ بے بس سی کھڑی رہ گئی۔ اس نے چند دن بعد اسے ملنے کا کہا مگر

آدرش نے اس کا سیل فون نمبر فرید بابا کے موبائل میں سیو کرا کے ہی دم لیا۔ کہ وہ اسے فون کر کے ملاقات کا ٹائم ڈیٹا کرے گا۔ بچہ خاصا ذہین تھا۔



اگلے دن وہ پھر سیٹ (Sets) پر موجود تھی۔ وہ واپس ساحل گئی تھی مگر آدرش سے ملاقات کے بعد جی ایسا اچاٹ ہوا کہ بغیر کچھ لکھے وہاں سے چلی آئی تھی۔ اسے سمندر سے عشق تھا۔ مگر یہ پہلی بار تھی کہ وہ سمندر کے پاس سے بنا سراپ ہوئی اٹھ آئی تھی۔ وہ ہمارے مشورہ کرنے کو چلی آئی مگر بے اختیار ایک چہرے کی تلاش میں نظر بھٹک گئی۔ وہ اسے کہیں نظر نہیں آئیں۔ وہ مایوس سی ہو گئی۔ ہاں شاید اندر تھی۔ باہر سیٹ پر معمول کی سی گہما گہمی تھی۔ کسی رومانوی ملاقات کے لیے سیٹ تیار کیا جا رہا تھا۔ لال غبارے جگہ جگہ نظر آرہے تھے۔ ایک طرف لیپ ٹاپ پر گانے لگا کر چیک کرتے طارق کی زبان مسلسل چل رہی تھی۔ وہ کوئی اچھا سا انگلش نمبر ڈھونڈ رہا تھا اور پاس کھڑے نسیم بادی کو جانے کون کونسی فلم کے نام اور ہسٹری بتا رہا تھا۔ سب طارق کو فلموں کا انسائیکلو پیڈیا کہتے تھے۔ اکثر نسیم بادی اسی سے پس پردہ موسیقی کے لیے assign کرتے تھے۔ سب کرداروں کے اپنے اور بچنل ٹریکس تھے۔ مگر بعض جگہ پرانا موسیقی کا ریکارڈ بھی کام آ جاتا تھا۔ وہ خود تاروں میں الجھے تھے۔ انکا اسٹنٹ آج بھی غائب تھا۔ صلہ مسکراتی ان کی جانب بڑھی۔

”کیا ہو رہا ہے؟“

”ارے صلہ تم کب آئیں۔“ وہ مصروف سے انداز میں بولے۔ ”دیکھو ذرا ایاز کا بچہ پھر چھٹی کر کے بیٹھ گیا۔“ رف ساحلیہ، ملکی بڑھی شیو اور چہرے پر ہمیشہ کی طرح کا پھیلا سکون صلہ کو بے اختیار ان پر پیار آیا۔

”کوئی کام ہے تو مجھے بتائیں۔“ وہ خوشدلی سے بولی۔

”پہلے ذرا یہ سوچ کر وائیں اعفان زارا کے لیے انہی کی ڈیٹ شریف پر گانا چلانا ہے۔“ ان سے پہلے طارق بول اٹھا۔

”زرینہ کی چوائس بہت اچھی ہے ان سے پوچھ لیں۔“ وہ بے ساختہ بولی تھی۔

”فائل تو وہ ہی کریں گی۔ ابھی تو وہ ان دونوں کے ساتھ سر کھپا رہی ہیں۔ بالاج ہما جیسی کیمسٹری جو نہیں بن پارہی ان دونوں کی۔“ وہ بولا۔ اور گانے تبدیل کر کے اس سے پوچھنے لگا۔ ایک نمبر پر اس نے اسے روکا۔ اس کی ٹیون آشناسی لگ رہی تھی۔ ”طارق یہ ہما، بالاج کے لیے کیسا رہے گا۔“ ”مگر ان کا تو کوئی ڈیٹ والا سین نہیں ہے۔ ویسے بھی ان کا اور بچنل ٹریک ہے۔“

”وہ تو سبھی کا ہے۔ ویسے ہی کبھی استعمال ہو جائے گا۔ ان پرفٹ بیٹھتا ہے۔ اور اس سے جو پہلے ٹریک آیا تھا وہ زارا، اعفان کے رکھ دینا۔“ وہ رونن کیٹنگللا When you say nothing at تھا جو ہما بالاج کے لیے اس نے سچسٹ کیا تھا۔ نسیم بادی دوسری جگہ مصروف تھے سو طارق کو اپنی ذہانت جھاڑنے کو صلہ مل گئی۔ وہ بے توجہی سے اس کی رونن کیٹنگ کی سہوی، ہائیو گرافی سن رہی تھی کہ رخ، موڑ تے کسی سے ٹکرائی۔ گانا ہنوز فضا میں گونج رہا تھا۔ بالاج جو ہما کو فلسفہ کہنے کا طریقہ سمجھا رہا تھا چونک کر مڑا تھا۔ وہ دونوں ابھی باہر نکلے تھے۔ صلہ ٹکرائے کے بعد جیسے کرنٹ کھا کر بے ساختہ پیچھے ہٹی تھی۔ بالاج اس کی حرکت کو محسوس کر کے رہ گیا۔ اس سے دور ہونے کے چکر میں طارق کی خاصی قریب ہو گئی تھی۔ اس کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔

"The smile on your face lets me know you need me."

The truth in you eys lets me know, you never leave me.

The touch of your hand says you catch me, wherever i fall,

You say is best when you say nothing at all.

روشن کینٹنگ کی آواز گونج رہی تھی دونوں نے یک بیک نظریں چرائی تھیں ایک لمحہ لگا تھا انہیں ٹھنک کر رکنے جانے میں اور پھر ذہن سے جھٹکنے میں بھی۔ وہ واپس ہما کی جانب متوجہ ہوا تھا اور وہ نسیم صاحب کی جانب بڑھ گئی۔ انہوں نے اسے ایک سٹرا کی تیاری کے لیے دوسرے کمرے میں بھیج دیا۔

”ہاں طارق چورز کیا؟“ زریزہ مصروف سے انداز میں پوچھ رہی تھیں۔

”جی میم ہو گیا۔ آپ ذرا یہ دیکھیں یہ شاہو اور ہمارا کتنا سیٹ ہو رہا ہے نا۔“ اس نے گانے کو ریو اسنڈ کیا۔

”افوہ۔ میں نے زارا اعفان کے لیے کہا تھا۔“ وہ جھنجھلائیں۔

”جی وہ بھی کیا ہے۔ صلہ دونوں کے بتا گئی ہے۔“ روشن کینٹنگ کی آواز پھر سے گونج اٹھی تھی۔ ان کے تنے اعصاب قدرے ڈھیلے پڑ گئے۔ وہ واقعی ان دونوں پر فٹ بیٹھتا تھا۔ کچھ نہ کہتے ہوئے بھی بہت کچھ کہتا ہوا آج دیتا رشتہ۔

اعفان زارا کے لیے بھی اس نے اچھا نمبر سلیکٹ کیا تھا۔ ”اچھا یہاں عجائز کو دو میں آتی ہوں۔“ وہ واپس ان دونوں کے پاس چلی گئیں۔

..... ☆

ٹھنڈے پانی کے زوردار چھپا کے مار کر اس نے دیوار گیر آئینے میں اپنا عکس دیکھا۔ دائیں آنکھ انفیکشن کی وجہ سے ابھی بھی سرخی مائل تھی۔ وہ دوبارہ واش بیسن پر جھک گیا۔ چہرہ رومال سے خشک کرتے وہ باہر آیا تھا پھر جیب سے اپنی قیمتی گھڑی نکال کر پہنے لگا۔ دفعتاً ہلکی سرگوشیوں کی آواز نے اس کی توجہ اپنی جانب مبذول کی۔ وہ وہم سمجھ کر سر جھٹکتے واپس جانے لگا۔ لیکن ٹھنک کر رُک گیا۔ اب کے آواز پہلے سے قدرے بلند تھی۔ واش روم کے پیچھے قدرے سنسان جگہ تھی۔ آوازیں وہیں سے آرہی تھیں۔ وہ ہلکے قدم اٹھاتا اس طرف بڑھا۔

”پلیز مجھے جانے دیں۔“ وہ کسی لڑکی کی سہمی سی آواز تھی۔

”کیوں میری جان۔ بہت شوق تھا نہ مجھ سے ملنے کا۔ اب ڈھنگ سے مل تو لو۔“ کسی مرد کی مخمور آواز گونجی تھی۔ اس آواز کو وہ لاکھوں میں پہچان سکتا تھا۔ اس کے چہرے پر استہزائیہ مسکراہٹ ابھری۔

”اوہ تو یہ تم ہو۔“ وہ یکدم اس دیوار کی اوٹ کی پار جا کھڑا ہوا تھا۔ پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے آنکھوں میں تمسخر لیے بڑے اطمینان سے ان کے سامنے کھڑا تھا۔ لڑکی دیوار سے لگی کھڑی تھی اور کھلے گریبان کے ساتھ اس پر جھکا اعفان باری تیر کی طرح سیدھا ہوا تھا۔ وہ کم عمر لڑکی کالج کے کپڑوں میں ملبوس تھی۔ اور متوحش نظر آرہی تھی۔

”کیا خیال ہے ایک تصویر نہ ہو جائے۔“ بالاج نے سیل فون سامنے کیا۔ اعفان کا چہرہ لٹھے کی مانند سفید پڑ گیا۔

”ارے ڈر کیوں رہے ہو۔ اسی میگزین میں دوں گا۔ جس میں تم میری لواستوریز چھپواتے ہو۔“ وہ واضح اس کا تمسخر اڑا رہا تھا۔ آئی فون

کی سکرین ہنوز تازیک تھی۔ لڑکی دوپٹہ سنبھالتے فوراً وہاں سے نکلی تھی۔ اعفان شکار ہاتھ سے نکل جانے پر تلملایا تھا۔
 ”فین تھی میری۔ کب سے پیچھے پڑی تھی۔ اسی سے جان چھڑوا رہا تھا۔ اس نے صفائی پیش کی تھی۔

”کم آن.....“ وہ استہزائیہ ہنسا۔ ”جیسے میں تمہیں جانتا نہیں ہوں۔“ اس نے مسکراتے ہوئے فون جیب میں رکھا۔ اعفان جل کر رہ گیا۔
 اس کے آنکھوں اور لہجے میں اس کے لیے ہمیشہ تمسخر ہوتا تھا۔ حالانکہ وہ اس سے زیادہ قابل، زیادہ خوبصورت تھا۔ اس کے باوجود چھوٹا سا رول کر کے
 اس کے حصے کا بھی سارا فیم سیٹ لیتا تھا۔ حتیٰ کہ وہ تمام لڑکیاں جن میں وہ انٹر سٹڈ تھا۔ سبکو بالاج نے اپنی جانب کھینچ لیا تھا۔ اسی جلاپے میں اس نے
 بالاج کے سلیکنڈ لڑچپکے سے میڈیا کو دینے شروع کر دیے تھے۔

”اور تم جو ہوٹلوں کے کمروں میں کرتے پھرتے ہو وہ۔ یہ تو کچھ نہیں اس کے آگے۔“ اعفان نے بھی جواب تیار رکھا تھا۔ جو اب بالاج کا
 قہقہہ فلک شکاف تھا۔

”جیلس..... تمہیں کوئی منہ جو نہیں لگاتی۔“ اعفان سٹپٹایا۔
 ”تو پھر ٹھیک ہے نا۔ تم وہ کرو جو تمہیں ٹھیک لگتا ہے اور میں بھی وہی کروں گا جو مجھے ٹھیک لگتا تھا۔“ اعفان گویا دھمکی دی۔
 ”بالاج کی طنزیہ مسکراہٹ سمٹی تھی۔

”میں جو کرتا ہوں ڈنکے کی چوٹ پر کرتا ہوں۔ تمہاری طرح اپنے چھوٹے سے فلیٹ میں مٹھلیں نہیں سجاتا۔ پھر اس کے قریب جا کر
 پھنکارا۔“ جو بھی کرو مجھے فرق نہیں پڑتا۔ مگر محلے کی جھگڑا لوروں کی طرح میری سابقہ بیوی کو رپورٹیں دینا بند کرو۔ اس کی نام نہاد مامتا جاگ اٹھتی
 ہے۔“ اعفان طمانیت سے مسکرایا تھا۔

”تو کیا غلط ہے اس میں جو شخص شراب و شباب میں ہر وقت ڈوب رہتا ہو وہ اپنے بچوں کی کیا تربیت کرے گا۔ بہتر نہیں کہ ان کی ماں ہی
 پالے انہیں۔“ وہ سکون سے بولا تھا۔

”تو وہ کون سا نمازی پرہیزگار ہے۔“ وہ تلخی سے بولا تھا۔ ”بہر حال کسٹڈی کیس تو میں جیت ہی جاؤں گا۔ تم اپنی فکر کر۔“ اس ڈھکی چھپی
 دھمکی پر اعفان کلس کر رہ گیا۔ بالاج تمسخر اڑاتی نظر اس پر ڈال کر وہاں سے چل دیا۔

آئی ڈراپس ڈالنے کے باوجود انفیکشن ٹھیک نہیں ہوا تھا۔ اس کے لیے آنکھ کھولنا دو بھر ہو گیا تھا۔ وہ زرینہ سے ایکسکیز کرتا آرام کرنے کی
 غرض سے کامن روم کی طرف بڑھ گیا۔ مگر رستے میں ٹھنک کر رہ گیا۔

سامنے وہ دونوں صلی کی گود میں موجود لیپ ٹاپ کی سکرین پر کچھ دیکھتے کھلکھلا کر ہنس رہی تھیں۔
 ”کچھ لوگوں کے لیے زندگی کس قدر آسان ہے۔“ وہ سوچ کر رہ گیا۔ چند منٹوں پہلے اعفان سے کی گئی باتیں یاد آ گئیں۔ بچوں کی کسٹڈی
 کا کیس اس کے لیے ٹیڑھی کھیر ثابت ہو رہا تھا۔ تمام حالات اس کے خلاف تھے۔ مگر وہ مگر بھی بچے اس کے حوالے نہیں کرنا چاہتا تھا۔ تاسف سے سر
 جھٹکتا آگے بڑھ گیا۔

”ویسے بھی آج مجھے خیریت نہیں لگتی۔ آج صلہ رحمان ڈھنگ کے کپڑوں میں تشریف لائی ہیں۔ ہمارے قدرے اونچی آواز میں بولی تھی۔“ کوئی فائدہ نہیں ویسے۔ زرینہ۔ تمہیں پھر بھی اپنی فلم میں ہیروئن نہیں لینے والی۔“ ہمارے اس کے نفیس سے سیاہ فراق پر تبصرہ کیا۔

”میں ہیروئن بن گئی تو فلم کون دیکھے گا۔“ وہ مضحکہ اڑاتی ہنسی۔ آج اس کا موڈ بہت اچھا تھا۔ اور جب وہ موڈ میں ہوتی تو پر تکلف ڈریسنگ کر لیا کرتی تھی اور پھر آج سیٹ پر آتے ہی سب کی زبان پر ایک سی خبر سننے سے خوشگوار حیرت ہوئی تھی۔ زرینہ کا فلم بنانے کا دیرینہ خواب پورا ہونے جا رہا تھا۔ جانے کب سے کہانی تیار کروا رکھی تھی، اب جا کر سپانسرز ملے تھے۔ وہ ان کے لیے بہت خوش تھی۔

”آج کہیں ڈیٹ ویٹ پر جانے کا ارادہ تو نہیں ہے۔“ ہمارے اسے چھیڑا۔ ”ڈیٹ کے لیے ایک عدد لڑکا درکار ہوتا ہے۔ وہ کہاں سے آگے گا۔“ صلہ ہنس دی۔

”تو پھر یہ تیاریاں کس خوشی میں۔“ ہمارے مشکوک ہوئی۔

”بھئی رات کو میں نے اپنی کہانی کا ایسا اینڈ سوچا ہے کہ تم پر دھوگی تو حیران رہ جاؤ گی۔ انشاء اللہ لکھنا بھی شروع کر دوں گی کیونکہ اب مجھے اپنے اس مرکزی کردار کی مجسم صورت مل گئی ہے، ایمان سے سوچ سوچ کر ہی دل گارڈن گارڈن ہوا جا رہا ہے۔“ وہ ایکسائٹڈ سی بولی۔

”مرکزی کردار کی مجسم صورت کون؟“ ہمارے پوچھا۔

”وہ سر پرانز ہے جانی۔ کچھ دنوں تک بتاؤں گی۔“ وہ کہتی لیپ ٹاپ بند کرتی اٹھ گئی۔ تبھی ہمارا بلاوا آ گیا۔ وہ چل دی۔ صلہ لیپ ٹاپ اٹھاتی کامن روم کی جانب بڑھی۔ اسکا لیپ ٹاپ بیگ کامن روم میں پڑا تھا۔ کمرے کا دروازہ کھلتی وہ ٹھٹک کر رہی تھی۔ دائیں جانب صوفے پر بالاج آنکھوں پر بازو رکھے دراز تھا۔ اس کے قیمتی جوتوں میں ملبوس پاؤں صوفے کے پینڈل سے نیچے لٹک رہے تھے۔

اس کے بیگ کا سٹرپ اسی صوفے کے بازو پر لٹک رہا تھا۔ جہاں اس وقت اس کا سر تھا۔ وہ متذبذب سی کھڑی سوچے گئی۔ بیگ یہاں چھوڑنا نہیں چاہتی تھی اور اس کے بغیر جا بھی نہیں سکتی تھی۔ اینٹرنی کی سونڈھی مہک سارے میں پھیلی تھی۔

دفتر سینٹرل ٹیبل پر پڑا اس کا موبائل بجا تھا۔ کمرے کے سکون میں جیسے شگاف پڑا تھا۔ اس نے سوچا اب وہ اٹھے گا تو بیگ لے کر چلی جائے گی۔ سیاہ پلین شرٹ اور ہم رنگ ڈریس پینٹ میں ملبوس شاہو کے سکون میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ فون بج کر خاموش ہو گیا۔ وہ اب بھی شاید اس کی طرح رات بھر سو یا نہیں ہوگا۔ رات بھر وہ کام کرنے کے باعث سو نہیں سکی تھی۔

”مصروف ہوگا رات بھر پھر کسی ماڈل کے ساتھ۔“ اس پر نظر پڑتے اس نے تلخی سے سوچا تھا۔ جانے کیا ذہنیت تھی اس شخص کی۔ اسے دیکھ کر متضاد سوجھیں ذہن میں ابھرنے لگتی تھیں۔ دو سال سے وہ اس شخص کو دیکھ رہی تھی مگر اسے سمجھنے سے یکسر قاصر تھی۔ چند لمحوں میں بڑے بڑے فیصلے کرنے والا کھڑ دماغ آدمی اس نے کبھی اسے چھپھوری حرکتیں کرتے نہیں دیکھا تھا۔ اس کے باوجود ہر روز میگزین کے فرنٹ پیج پر اس کا کوئی نہ کوئی افیئر یا کسی ماڈل کیس اتھ تصویر چسپاں ہوتی تھی۔ اس کا فون پھر سے بجا تھا وہ جو کھڑی سوچ رہی تھی یکدم جھنجھلائی اسے ہنوز ایسا لیتے دیکھ کر کچھ سوچ کر اس نے آگے بڑھ کر فون اٹھایا اور سالکٹ پر کر دیا۔ اٹھاتے وقت تو اس نے سوچا نہیں تھا مگر اب رکھتے وقت اسے ڈر سا لگ رہا تھا۔ اگر وہ اٹھ گیا

تو کیا سوچے گا۔ بہر حال ہمت کر کے اس نے فون وہیں رکھ دیا۔ وہ واقعی گہری نیند سو گیا تھا۔

گہری سانس لیتے وہ ساتھ پڑے سنگل صوفے پر بیٹھ گئی۔ اب اسے اس کے اٹھنے کا انتظار کرنا تھا۔ رات بھر جاگنے کے باعث سر درد سے پھٹا جا رہا تھا۔ کمرے میں ملگجی سی روشنی تھی۔ کمرے کے اکلوتے روشن دان سے چھن کر آتی دھوپ کی تپش قدرے کم ہو گئی تھی۔ کس لمحے اس کی آنکھ لگی اسے خبر ہی نہ ہوئی۔ ٹیبل پر پڑا فون واہیریت کرتا فرش پر آگرا۔ صوفے پر لیٹے وجود میں ہلکی سی جھنش ہوئی تھی۔ آنکھ سے بازو ہٹا کر چند لمحے اس نے ارد گرد منظر کو سمجھنے کی کوشش کی۔ پھر گھڑی دیکھتا یکدم اٹھ بیٹھا۔ فرش پر سے اٹھاتا وہ ٹھٹک گیا۔ اس کے بائیں جانب سامنے دیوار کے ساتھ لگے صوفے پر وہ بے خبری سوتی صلو کو دیکھ کر چونک گیا تھا۔ اس کی گردن ایک طرف کو ڈھلک گئی تھی۔ روشن دان کے عین نیچے بڑے صوفے پر بیٹھے وجود پر ہلکی دھوپ کی روشنی عجیب سا تاثر پیش کر رہی تھی۔ وہ یک ٹک اسے دیکھتے گیا وہ لیپ ٹاپ کسی متاع کی طرح سینے سے لگائے بیٹھی تھی۔ وہ متحیر سا اٹھا کچھ سوچ کر وہ اس کی جانب بڑھا تھا۔ وہ ہمیشہ اس سے احتراز برتی تھی۔ کبھی کبھی اس کا احتراز غیر ضروری ہوتا تھا۔ مگر اس نے کبھی نوٹ نہیں کیا تھا۔ مگر یوں اسے سامنے دیکھ کر وہ سوچ کر رہ گیا تھا آخر کیا وجہ تھی کہ وہ اسے ایسے ٹریٹ کرتی تھی جیسے وہ اچھوت ہو یا وہ بالاج سے از حد خوفزدہ ہو۔ اور کبھی کبھی تو ایسے تڑخ کر جواب دیتی تھی جیسے اسے کچھ سمجھتی ہی نہ ہو۔ ان دنوں وہ ویسے بھی یکسانیت سے بیزار ہونے لگا تھا شاید اسی لیے اس پر غور کر رہا تھا۔ ورنہ دو سالوں میں کبھی اس نے اس پر توجہ نہیں دی تھی۔ ”ہاں شاید میں یکسانیت سے ہی بیزار ہو کر اس پر غور کر رہا ہوں۔ ورنہ میری ٹائپ کی تو نہیں ہے۔“ اس نے گویا خود کو تسلی دی۔ اور اس میں خاصا کامیاب بھی ہوا۔ صوفے پر پڑا کوٹ اٹھاتے اس کی نظر بلیک سٹریپ پر پڑی۔ تو وہ سمجھ گیا کہ وہ اس کے اٹھنے کا انتظار کر رہی ہے۔ بھلا اسے اٹھا دیتی۔ وہ گہری سانس لیتا باہر نکل گیا۔



”صلو آرہی ہو پھر ہمارے ساتھ؟“ زارا نے پوچھا تو اپنے خیالات میں گم وہ چونک کر مڑی تھی۔ زارا گرم سویٹر اور منظر لپیٹے ڈز پر جانے کو تیار کھڑی تھی۔ وہ مسکرا دی۔ کراچی والوں کو سردی بہت لگتی تھی۔ خود وہ ہلکی سی شال لپیٹے کھڑی تھی۔

”نہیں یار..... تم لوگ جاؤ میرا موڈ نہیں ہے۔“ اس نے شائستگی سے معذرت کی۔ سب باہر کھانا کھا جا رہے تھے۔ زرینہ کی بدولت ایسی ٹریڈ ملتی رہتی تھیں۔ وہ آج ہما، ندیا کے مشترکہ کمرے میں رات گزارنے رکی تھی۔

”سوچ لو..... زرینہ بھی جا رہی ہیں۔“ زارا نے شرارتاً کہا تو وہ مسکرا دی یہ ہما بھی نا۔ کوئی بات جو اس کے پیٹ میں ٹک جائے۔

”اچھا لالچ ہے۔ لیکن طبیعت ذرا بوجھل سی ہے ورنہ ضرور جاتی۔“ وہ ناک پونچھتی بولی۔ فلو نے دو دن سے برا حال کر رکھا تھا۔

”اوکے۔“ As you wish ”وہ بھی بے نیازی سے کندھے اچکاتی سیڑھیاں اترنے لگی۔ تبھی فون آنے پر ایک سیڑھی پر رک گئی۔

”ہاں شاہو۔ آرہی ہوں بابا۔ ذرا جو تم میں صبر ہو۔“ وہ ہنستی فون بند کرتی چلی گئی۔ وہ شاید پارکنگ میں انتظار کر رہا تھا۔

”کس قدر استحقاق سے نام لیتی ہے اس کا۔ کیا سب لڑکیاں اتنی ہی پاگل ہوتی ہیں۔ پر سنالٹی اور پیسے پر مر جانے والی۔ کیا زارا نہیں جانتی کہ اس نے اپنی پہلی کو لیکز اور ماڈلز کے ساتھ کیا کیا۔ یا پھر اس فیلڈ کے لوگوں میں وفا ہی نہیں ہے۔“ وہ تاسف سے سوچتی سر جھٹک کر سیڑھیاں

اتر گئی۔ عجب بیزاری اور بوجھل پن سا تھا۔ اپنی سوچوں میں گم وہ ساحل کی طرف نکل آئی۔ شام ڈھل چکی تھی۔ ریٹ ہاؤس تقریباً خالی تھا۔ ساحل پر چہل قدمی کرتے وہ خاصی دور نکل آئی تھی۔ وہ خاصا مہنگا کمرشل ایریا تھا۔ ابھی بھی شام ڈھلے کوئی دوسری ٹیم شوٹنگ میں مصروف تھی۔ وہ سرسری سی نظر ان پر ڈالتی خالی انڈینی کی سی کیفیت میں قدرے سنسان جگہ پر لگے سنسکی بینچ پر آ بیٹھی۔ سمندر کی جانب سے آنے والی بخ بستہ ہوائیں اسے مزید سمٹنے پر مجبور کر رہی تھیں۔ عجب بڑمردگی سی چھائی تھی۔ امی کا فون آیا تھا۔ وہ فون پر بہت خوش لگ رہی تھیں۔ اسکا بڑا بھائی شرنیل رحمان عرف شیر سی چند مہینوں میں واپس آنے کا کہہ رہا تھا۔ وہ خوش تھی مگر اس خوشی کے ساتھ دکھ کا گہرا احساس بھی تھا۔

خالی خالی نگاہوں سے دور تک پھیلے سمندر کو دیکھ رہی تھی۔ شیر سی کے واپس آنے کی خبر اچھبے کی بات نہیں تھی۔ وہ کچھ بن کر چھ حاصل کر کے ہی واپس آ رہا تھا۔ اسے آج بھی یاد ہے وہ رات جب وہ ابا سے اونچی آواز میں بات کر رہا تھا۔ طویل سانس خارج کرتے اس نے اندر کی تلخی کو جیسے جھٹکنا چاہا۔ ڈھائی سال سے وہ اس فیلڈ میں تھی اور ابھی تک ایسے نام و نشان تھی۔ سودوزیاں، حساب کتاب کے جیسے رجسٹر سے کھل گئے تھے۔ سب سودے جمع، تفریق، ضرب کرنے کے بعد جواب پر غور کیا تو حاصل حیات چند کاغذ کے ٹکڑے، مٹی مٹی تحریروں، دھند میں لپٹے راستوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ زندگی کی کتاب کے ورق پلٹنے پر انکشاف ہوا کہ کوئی بھی دن یا شخص ایسا نہیں تھا کہ جسکی طرف اشارہ کر کے کہہ سکتی کہ یہ میرا ہے۔ “تم واقعی بہت بڑی لوزر ہو صلہ رحما۔ اتنے سالوں میں بھی کچھ نہ پاسکی نہ شہرت، نہ مقام نہ اپنے خواب، اور نہ جمال.....” جمال یوسف اس کی زندگی کا پوشیدہ اور سب سے خوبصورت باب تھا۔ مگر لا حاصل تھا۔ دل میں ہوک سی اٹھتی تھی۔

☆.....

زرینہ کو جیسے ہی پتا چلا کہ ثانیہ قریب ہی شوٹ پر آئی ہیں تو وہ سب چھوڑ چھاڑ کر ان سے ملنے چلی آئیں۔ اتنے سالوں بعد ملنے کے باوجود لگتا ہی نہیں تھا کہ اتنے عرصے رابطہ منقطع رہا۔ ثانیہ بھی ان سے مل کر بہت خوش ہوئیں۔ وہ بیرون ملک مقیم تھیں۔ مگر اچھے پروجیکٹ کی آفر پر وہ رہ نہیں پائیں اور فوراً پاکستان چلی آئیں۔ اتنے عرصے بعد پھر سے یہ کام کرنے میں بہت لطف آ رہا تھا۔ دونوں پرانے وقتوں کی یاد تازہ کر رہی تھیں کہ ان سے کچھ فاصلے پر تاریک گوشے میں کوئی بیٹھا نظر آیا تو زرینہ چونک سی گئیں۔ فلیش لائٹس دوسری جانب تھیں اسکے باوجود بینچ پر بیٹھی صلہ انہیں صاف دکھائی دے گئی۔ انہیں حیرت ہوئی۔ انہوں نے ہمیشہ اسے ہمایا ندیا کے ساتھ دیکھا تھا۔ ثانیہ فارغ تھیں سو وہ ان سے تھوڑی دیر بعد ملنے کا کہہ کر اس جانب چلی آئیں جہاں دنیا و مافیہا سے بے خبر صلہ کے چہرے پر عجیب سا تاثر تھا۔ کچھ سوچتی وہ اس کے ساتھ بینچ پر آ بیٹھیں۔ مگر اس کی محویت نہیں ٹوٹی تھی۔ ہلکی سی شال لپیٹے بالوں کی چٹیا ایک کندھے پر ڈالے وہ ہنوز بے نیاز بیٹھی تھی۔

”لگتا ہے اپنی کہانی کے اینڈ تک پہنچ گئی ہو۔“ وہ خوشگواریت سے گویا ہوئیں صلہ نے چونک کر انہیں دیکھا۔ مگر اگلے لمحے نارمل سے انداز میں بولی تھی۔ “آپ یہاں؟ آئی مین آپ تو ڈر پر گئی تھیں۔“

”نہیں مجھے ثانیہ سے ملنا تھا۔“ ان کے جواب پر اس نے تفہیمی انداز میں سر ہلایا۔ آتے وقت وہ ثانیہ کو دیکھ چکی تھی اور ان دونوں کی گہری دوستی سے بھی واقف تھی۔ وہ آج خلاف توقع خاموش سی تھی۔

’وتم کیوں نہیں گئیں ہمارے لوگوں کے ساتھ؟ یہاں اکیلے ڈر نہیں لگتا؟‘ ان کا اشارہ سمندر کی جانب تھا جو رات کے سناٹے میں وحشت زدہ سا لگتا تھا۔ صلہ نے نفی میں سر ہلایا ”مجھے یہ سب پسند ہے۔ تیرا کی آتی تو شاید کہیں دور کسی جزیرے پر نکل جاتی۔ جہاں نہ دنیا ہوتی نہ دنیا داری۔“ وہ بے تاثر سے لہجے میں بولی تھی۔

”ماپوسی اچھی چیز نہیں ہوتی۔ اس دنیا میں رہ کر یہاں کے لوگوں میں گھل مل کر ہی سرخرو ہی حاصل ہوتی ہے۔“ وہ شگفتگی سے گویا ہوئیں۔ یہ ہنستی بولتی لڑکی، اداس سی انہیں اچھی نہیں لگ رہی تھی۔ وہ استہزائیہ ہنسی ”مجھے دنیا داری پر نہیں، دنیا کے دوغلے معیار پر اعتراض ہے۔“

”مثلاً.....“ زرینہ جیسے بڑی فرست میں تھیں صلہ نے چونک کر انہیں دیکھا تھا۔ ”اسد نیا میں خلوص نام کو نہیں ہے۔“ وہ رخ موڑ کر آہستگی سے بولی۔ زرینہ مسکرا دیں۔

بڑا گھسا پٹا سا جواب ہے مگر سچ ہے ماں باپ کے علاوہ کوئی بے غرض محبت نہیں کرتا۔“

”غلط.....“ صلہ کے اعتراض پر انہوں نے چونک کر اسے دیکھا۔ ”بے شک سب سے پر خلوص رشتہ والدین کا ہی ہے مگر اولاد میں واضح فرق تو وہ بھی کرتے ہیں۔ اولاد سے امیدوں کے نام پر مفاد ہی تو جڑا ہوتا ہے۔“ وہ بے تاثر سے لہجے میں بولی تھی۔ ”خیر یو تو لمبی بحث ہے اور شاید بے تکی بھی۔ میرا خیال ہے چلنا چاہیے۔“ وہ اٹھنے لگی لیکن زرینہ نے اس کا ہاتھ تھام کر واپس بٹھا دیا۔ آج کی نسل کے مسائل وہ اچھی طرح سمجھتی تھیں۔

”والدین بھی تو عام انسان ہوتے ہیں۔ انہیں بھی سہارے کی محبت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اولاد انہیں فرشتہ تصور کیوں کر لیتی ہے۔ جسکے صرف فرائض ہوتے ہیں اور کوئی حقوق نہیں ہوتے۔“ وہ سنجیدگی سے اس کی جانب متوجہ تھیں۔ صلہ کا سر جھک گیا۔ ”والدین کو بھی تو اولاد کو انسان ہی سمجھنا چاہیے۔ ڈاکٹر، انجینئر کے علاوہ ساری دنیا ٹکمی لگتی ہیں انہیں۔“

”تو اولاد کو چاہیے کہ انہیں اعتماد میں لے۔ اپنے شوق کے بارے میں سمجھائے۔ ضد کر کے کام کیوں خراب کرتے ہیں۔“ زرینہ کو اس سے بحث کرنا اچھا لگ رہا تھا۔ وہ آہستگی سے مسکرائی پھر بیچ کی پشت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ ”چلیں پھر آپ کو ایک مثال دیتی ہوں۔ میرا بڑا بھائی شیریں خود غرضی کے سارے ریکارڈ توڑتا ڈکڑ جھگڑ کر امریکہ چلا گیا۔ 7 سال سے اس نے اپنی شکل نہیں دکھائی۔ اس دوران اس کی ماں کتنا تڑپی، کتنا روئی اسے کوئی فرق نہیں پڑا۔ اس کے باپ کو اپنے جوان جہاں بیٹے کی کس قدر ضرورت تھی۔ ان کے جھکے کاندھوں نے بھی اسے کوئی احساس نہیں دلایا۔ ابا کے خواب کے مطابق انجینئر بھی نہیں بنا۔ اس سب کے باوجود اگر آج واپس آتا ہے تو اس کا استقبال سب کچھ بھول بھال کر انتہائی گرمجوشی سے کیا جائیگا۔ اس کے سارے گناہ معاف ہو جائیں گے۔ اگر کسی کا گناہ معاف نہیں ہوگا تو اس لڑکی کا جو ہر مشکل میں ساتھ رہی مگر ڈاکٹری میں فیل ہو گئی۔ اس کا ذاتی شوق ان نظروں میں محض وقت کا زیاں ہے۔“ وہ رکی۔ گلے میں آنسوؤں کا پھندہ سا پھنسنے لگا تھا۔

”لیکن تم یہ بھی تو دیکھو کہ تم اپنا مقابلہ ان کے اکلوتے بیٹے سے کر رہی ہو۔“ وہ نرمی سے گویا ہوئیں۔ ”اور تم کی جان تو تمہارا بھائی کن مشکلوں سے وہاں سے سیٹ ہوا ہوگا۔“ صلہ سامنے نظریں جمائے بیٹھی تھی۔ ابھی بھی اس کے سکون میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔

”وہ خوش ہے وہاں پر۔ اپنی مرضی سے زندگی گزار رہا ہے۔ پچھلے سال نیشنلٹی بھی مل گئی ہے۔ اور مجھ سے دونوں چھوٹی بہنیں ذہین ہیں۔“

کوئی ایک تو ڈاکٹر بھن ہی جائیگی۔ ان کے ہر چھوٹے سے چھوٹے ٹیسٹ پر انہیں ڈھیروں دعائیں اور توجہ ملتی ہے۔ جبکہ ایک ہی کمرے میں ہونے کے باعث مجھے جلدی رات کو لائٹ آف کرنے کا حکم ملتا تھا کہ بہنیں ڈسٹرب ہوگی کیونکہ میرا رات کو جاگ کر کیا جانے والا کام فضول جو ہوتا تھا۔ جلدی جلدی پیسہ اور عزت جو نہیں ملتی اس رائٹنگ کی فیلڈ میں۔ ”وہ رکی۔ آنکھوں کے گوشے بھیگ گئے تھے۔ زرینہ خاموشی سے اسکی بات سن رہی تھیں۔“ پھر کن میگزینز یا ڈائجسٹ میں کہانیاں چھپی کتنے فین میلز آئے میں نے بتایا اور نہ کسی نے پوچھا۔ ہاں البتہ اب کوئی بڑا پروجیکٹ ملے جس میں پیسہ شہرت بہت ہو پھر شاید میرے گناہ معاف ہو جائیں گے اور ڈاکٹر زوالا پر وٹو کول ملے گا۔ لیکن شیریں کے صرف واپس آ جانے پر ہی اس کی بدتمیزیاں بھی معاف ہیں چاہے وہاں امریکہ میں ٹیکسی ہی کیوں نہ چلاتا رہا ہو۔“ وہ یکدم خاموش ہو گئی۔ زرینہ دکھ سے اسے دیکھ کر رہ گئیں۔ پاکستان میں کم و بیش ہر نڈل کلاس آرٹسٹ کا یہی المیہ تھا۔

ہوا خشکی بڑھتی جا رہی تھی۔ شوٹنگ والے کب کے جا چکے تھے۔ صرف سمندر کی لہروں کی سرسراہٹ سنائی دے رہی تھی۔ انہیں یکدم وحشت سی محسوس ہوئی وہ اٹھ گئیں۔

”اٹھو بیٹا..... یہاں اس وقت اکیلے بیٹھنا ٹھیک نہیں۔ اٹھو شاہاش۔“ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اٹھ گئی۔ آہستگی سے قدم اٹھاتے دونوں چلنے لگیں۔ ”یہ کوئی اتنے بڑے جرم نہیں ہیں کہ تم ساری زندگی انہیں بلیم کرو۔ اور ساری اچھی چیزیں فراموش کر دو۔“ وہ سر جھکائے خاموشی سے چلتی صلیب سے بولیں۔ ”میں سب یاد رکھتی ہوں زرینہ..... اچھا بھی اور برا بھی۔ آپ نے پوچھا سو میں نے مثال دے دی ورنہ یہ شکایتیں میں خود سے کرنا بھی پسند نہیں کرتی۔“ سینے پر بازو لپیٹے وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھا رہی تھی۔

”ویری گڈ..... سمجھدار لڑکی ہو۔“ انہوں نے اسے تھپکی دی۔ ”مگر جانے کیوں مجھے لگ رہا ہے کہ تم اصل وجہ چھپا گئی ہو۔ میں مان ہی سکتی کہ تم اتنی چھوٹی سی بات پر اداس تھیں۔“ صلیب کھل کر مسکرا دی۔ کسی نے کہا تھا کہ زرینہ سے کوئی بات چھپانا خاصا مشکل کام ہے۔ آج دیکھ بھی لیا۔ ”مگر میں یہ بھی تسلیم کرتی ہوں کہ تمہیں بات کا رخ اپنی مرضی سے موڑنا خوب آتا ہے۔“ وہ مسکرا کر سادگی سے تسلیم کر رہی تھیں۔

”ویسے ثانیہ آپ کی تو سب سے پہلے مبارکباد موصول ہوئی ہوگی آپ کو فلم کے بارے میں۔“ وہ قدرے نارٹل سے انداز میں بول رہی تھی۔ ”ہاں وہ تو ہے۔ She is dearest friend۔ باقی داوے ثانیہ کو تو بڑا آپا کہاں جا رہا ہے اور میرا نام تم ایسے لے رہی ہو جیسے بچپن میں تمہارے ساتھ کرکٹ کھیلتی رہی ہوں۔“ انہوں نے شگفتگی سے اس کی خبر لی۔ تو وہ جھینپ گئی۔

”آئی یا آپا تو بڑا فارل سا لگتا ہے۔ دوستوں والی بات نہیں ہوتی۔ میرے نزدیک تو آپ اب بھی 27 سال پہلے والی شوخ، چلبلی سی زرینہ خان ہیں جنہوں نے آتے ہی پاک و ہند میں تھلکہ مچا دیا تھا۔ آپ تو سدا بہار لوگ ہیں۔“ وہ خوشدلی سے بولی۔

"Now you are flattering me" وہ بنا متاثر ہوئے بولیں۔ ”چلو بہت دیر ہو گئی۔ پانچواں کمرے میں میں۔“ وہ ریسٹ ہاؤس کی میز ہیوں تک آ گئے۔ وہ بھی اچھی بچیوں کی طرح ہمالوگوں کے کمرے کی جانب بڑھ گئی۔ زرینہ پر سوچ نظروں سے اسے جاتا دیکھتی رہیں پھر سر جھٹکتی ثانیہ سے ملنے چل دیں۔

ایڈیٹر کے ساتھ بیٹھے کام کر داتی زرینہ احمد خان چونک سی گئیں۔ ہما اور بالاج کے ایک منظر پر وہ گانا بالکل فٹ بیٹھ رہا تھا جو صلہ نے سچسٹ کیا تھا۔ انہیں حیرت ہوئی خلاف معمول آج وہ سیٹ پر دکھائی نہیں دی۔ بلکہ وہ تو دو تین دن سے نہیں آرہی تھی۔ کام کی مصروفیت کے باعث انہوں نے نوٹ ہی نہیں کیا۔ وہ پہلے بھی ہر روز نہیں مگر اکثر آتی تھی۔ اور کریو کا حصہ نہ ہونے کے باعث وہ سب کی نظروں میں آگئی تھی خود وہ بھی عادی سی ہو گئی تھیں۔ وہ جانتی تھیں کہ وہ نسیم بادی کے قریبی عزیزوں میں سے ہے تبھی اتنی آزادی سے پھرتی تھی۔ وہ خاموشی سے آتی اور کسی نہ کسی کام میں مصروف پائی جاتی۔ کسی کی ہیلپ کرواتے ہوئے، لیپ ٹاپ لیے بیٹھے ہوئے، کچھ لکھتے ہوئے، یا پھر ایکسٹراز ساتھ سرکھپاتے ہوئے وہ بیک گراؤنڈ میں ہوتے ہوئے بھی فرنٹ لائن میں نظر آتی تھی۔

مگر ان سے اس ڈرامے کے ذکر کے بعد سے اس نے کبھی مخاطب ہونے کی کوشش نہیں کی تھی۔ بعض دفعہ بڑی خاموشی سے کوئی ان کے چھوٹے موٹے کام کر جایا کرتا۔ جانے کیوں آج انہیں لگ رہا تھا جیسے وہ کام ان کا اسٹنٹ نہیں بلکہ وہ کرتی تھی۔ کیوں کہ ان دونوں میں انہیں خود وہ کام کرنے پڑے تھے۔ اور ایک دفعہ تو انہوں نے اسے اپنے آفس سے نکلتے ہوئے بھی دیکھا۔ تاہم حد درجہ مصروفیات کے باعث وہ غور ہی نہ کر پائیں کہ اکثر ان کی ٹیبل پر تازہ کافی کا کپ کون رکھ جاتا تھا۔ اسی طرح کے اور بھی بہت سے چھوٹے چھوٹے واقعات بے اختیار انہیں یاد آئے تھے۔ وہ مسکرا دیں۔ بڑے غیر محسوسانہ انداز میں اس کی یہ خیال رکھنے والی ادا انہیں اچھی لگی تھی۔

ان کا حلقہ احباب بہت محدود تھا۔ اور وہ خود اپنے دوست چنتی تھیں مگر کچھ تو تھا اس لڑکی میں جو وہ سوچنے پر مجبور ہو گئی تھیں۔

☆.....

وہ ریٹ ہاؤس کی سیڑھیوں پر بیٹھی کچھ لکھنے میں مصروف تھی اور دھیمی سروں میں وہی لوک گیت گنگنا رہی تھی جس کا اس نے اس دن بیڑہ غرق کیا تھا۔

وہ چند لمبے کسی سحر زدہ معمول کی طرح کھڑی سنتی رہیں۔ لوج، گداز، مٹھاس غرض ہر وہ عنصر اس کی آواز میں شامل تھا جو اس کلام کا خاصا تھا۔ وہ کبھی پرسوج نگاہوں سے سامنے دیکھتی اور کبھی اپنی فائل پر جھک جاتی۔ اگلا کھنکارنے کی آواز پر وہ چونک کر مڑی۔ زرینہ ہاتھوں میں دو مگ لیے کھڑی تھیں۔

”ارے آپ..... آئیے ناپلیز۔“ وہ خوشگوار حیرت سے بولتی ایک طرف کھسک گئی۔ زرینہ بڑا نہ تھا سو وہ اس کے پہلو میں بیٹھنے کی بجائے ایک سیڑھی اوپر بیٹھ گئیں اور کافی کا مگ اسے تھما دیا۔

”تھینک یو سوچ..... اس وقت اس کی اشد ضرورت تھی۔“ وہ و منون سی چھوٹے چھوٹے گھونٹ بھرتی رہی۔

”کوئی بات نہیں۔“ وہ شگفتگی سے بولی۔ ”اچھا خاصا گالیتی ہو۔ اس دن کیا ڈرامہ کر رہی تھیں۔“

”وہ.....“ صلہ ہنس دی۔ ”وہ تو جب میں بہت خوش ہوتی ہوں تو ایسے ہی گانوں کا بیڑہ غرق کرتی ہوں۔“ انہیں مسکراتے کافی کا گھونٹ بھرا۔ پھر اس کی فائل پر نظر پڑتے مسکرا دیں۔ ”کہیں تم کسی ناکام محبت کے افسانے تو نہیں لکھ رہی تھیں۔“ صلہ نے یکدم مسکراتے مگ پیچھے کیا۔

”بالکل بھی نہیں..... مجھے یہ خط کبھی نہیں ہوا۔“ وہ لا پرواہی بولی۔ اچھا جو لوگ ایسی بات منس کر کہتے ہیں ان کے دل میں ضرور چور ہوتا ہے۔“ انہوں نے مصنوعی سنجیدگی سے کہا۔

”اچھا پھر جو لوگ رو کر یاد رکھی ہو کر کہتے ہیں ان کے بارے میں کیا خیال ہے؟“ اس نے عادتاً سوال داغا۔

”ان کے دل میں واقعی چور ہوتا ہے مگر وہ اس افسانے کو چھپا نہیں پاتے۔ ان کے چہرے سے عیاں ہو جاتا ہے۔“ زرینہ زیر لب مسکراتی بولیں۔
 ”یعنی کہیں راہ فرار نہیں.....“ صلہ مسکرائی۔ ”خیر آپ تو آرٹسٹ ہیں آپ کو بہتر پتہ ہوگا۔ کام ختم ہو گیا آپ کا۔“ وہ کپ لیوں سے لگاتی رخ موڑ گئی۔ ”موضوع بدل رہی ہو؟“ زرینہ کو پھر شک سا ہوا۔ اسکی نظروں میں کچھ تو تھا۔ سپاٹ سا چہرہ لیے وہ سامنے دیکھ رہی تھی۔

”چلیں یہی سمجھ لیں آپ۔“ وہ نارمل سے انداز میں بولی تھی۔ زرینہ الجھی گئیں۔ وہ غضب کی چہرہ شناس تھیں۔ مگر سامنے بیٹھی لڑکی کو اس کم عمری میں بھی خاصا ضبط حاصل تھا۔ وہ کافی پتی کن اکھیوں سے اسے آبرو کر رہی تھیں۔ وہ جیسے کسی گہری سوچ میں گم تھی۔ فائل ایک طرف پڑی تھی۔ ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ ریٹ ہاؤس کی سیڑھیوں سے ساحل سمندر اور اس سے ٹکرانے والی بے قراں موجیں صاف دکھائی دیتی تھیں۔ کچھ دیر دونوں یونہی خاموش بیٹھی موسم اور سمندر کے نظارے سے لطف اندوز ہوتی رہیں۔

”ارے..... وہ یکدم چیخنی تو زرینہ نے گہرا کرا سے دیکھا۔“ کیا ہوا۔

”آپ پلیز دو منٹ بیٹھیے میں ابھی آئی۔ جائے گا نہیں بس 2 منٹ۔“ وہ کہتی اٹھ گئی اور تقریباً بھاگتے ہوئے اپنی کمرے کی طرف بڑھی۔
 زرینہ سر ہلاتی مسکرا کر رہ گئیں۔ گہری سانس لیتے انہوں نے خوشگواریت کو جیسے اندر محفوظ کرنا چاہا۔ صبح سے موسم ابرا آلود تھا۔ خشکی بے حد بڑھ گئی تھی مگر تھکاوٹ سے پُر دن گزارنے کے بعد اس وقت بہت بھلی لگ رہی تھی۔ آہٹ پر ان کی محویت ٹوٹی۔ صلہ اپنی فائل وہیں چھوڑ گئی تھی۔ جس میں سے ایک صفحہ سا باہر نکلا ہوا اسے پھر پھڑا رہا تھا۔ انہوں نے وہ صفحہ نکال کر سامنے کیا۔ اس پر پنسل سے کچھ مختصر سے خاکے بنے ہوئے تھے اور دوسری طرف کچھ لکھا ہوا تھا۔ وہ کسی کہانی کے الفاظ تھے۔ نچا کوں پر غور کیا تو وہ دو تھے۔ پہلا تو انہیں سمجھ نہ آیا۔ البتہ دوسرا خاصا واضح تھا۔ وہ حیرت سے اسے نکلے لگیں ایسے لگتا تھا جیسے سیڑھیوں پر ان دونوں کے بیٹھے ہوئے پیچھے سے ان کی تصویر لی گئی ہو۔ سامنے سمندر اور ساتھ بیٹھے وہ دونوں۔ ان کی پشت پر بکھرے بال، ایک کے لمبے اور بائیں جانب بیٹھی خاتون کے چھوٹے۔

وہ شاید ان کے آنے سے قبل یہ سچ بنا رہی تھی۔ باقی صفحات کلب میں مفید تھے۔ آہستگی سے صفحہ واپس فائل میں رکھتیں وہ سوچ میں پڑ گئیں۔ وہ کیسے جانتی تھی کہ زرینہ اس طرف آ رہی ہیں یا یہ صرف اس کی خواہش تھی۔ وہ الجھی گئیں۔

جیسی وہ بھاگتی ہوئی آئی اور دھپ سے فائل پیچھے کر کے اپنی جگہ پر آ کر بیٹھی۔ فرط اشتیاق سے اس کا چہرہ سرخ تھا۔ وہ بغور اسے دیکھ رہی تھیں مگر وہاں ایکساٹمنٹ کے علاوہ اور کچھ نہ تھا۔ وہ لیٹ ٹاپ گود میں لیے اسے آن کر چکی تھی۔ کچھ دیر بعد سکرین پر بڑی سی تصویر نمودار ہوئی۔ وہ ان کا آفیشن پیج لاگ ان کر چکی تھی۔ اکاؤنٹ کے کور پر ان کی جوانی کی خوبصورت سی تصویر آویزاں تھی۔ بے تحاشا ہنستی ہوئی تصویر۔ انہیں خوشگوار سی حیرت ہوئی۔ وہ اس وقت کی تصویر تھی جب وہ شہرت کی چوٹی پر تھیں۔ یادوں کی یلغار تھی جو یک آن بڑے عجیب انداز میں حملہ آور ہوئی تھی۔ وہ دیکھ کر

رہ گئیں۔ صلہ نے لیپ ٹاپ ان کی جانب بڑھا دیا۔ وہ جواب بھی اس تصویر میں کھوئی تھیں چونک سی گئیں۔ ڈسپلے پر ان کی آج کل کام کے دوران لی گئی تصویر لگی تھی۔

”ارے یہ سب کیا؟“ وہ پیچ کے فین فالوئنگ کی تعداد پر حیران ہوئیں۔

”آپ نہیں جانتے.....؟“ صلہ مایوس ہوئی۔ وہ سمجھتی تھی کہ انہیں ضرور اس کے بارے میں علم ہوگا۔ کوئی بھی میٹ پر یہ پیچ وزٹ کر سکتا تھا۔

”ہاں بہروز نے بتایا تھا اس کے بارے میں وہ سمجھ رہے تھے کہ شاید میں نے آفیشل Page خود بنوایا ہے۔ مگر اس وقت میں نے دھیان ہی نہیں دیا۔ یہ کمپیوٹر وغیرہ کے معاملے میں خاصی ٹکمی ہوں میں۔“ اور..... وہ کہتے کہتے رکیں۔ ”یہ کون سے ڈرامے کا کلپ ہے۔“ انہوں نے سب سے زیادہ دیکھی جانے والی ویڈیو چلا رکھی تھی۔ جس میں ان کے مختلف ڈراموں کے منظر کاٹ کر منظر کشی کی گئی تھی۔ ایک کلپ پر آ کر وہ ٹھہری گئیں۔ وہ کوئی غیر مشہور سیریل کا کلپ تھا سو انہیں یاد نہیں آیا ”یہ ایک شارٹ پلے تھا آپ کا۔ جس میں آپ ہیرو سے جھوٹ بول دیتی ہیں کہ آپ کی ایک twin سسٹر بھی ہے اور وہ بیچارہ یقین کر لیتا ہے اور آپ اس کو خوب بے وقوف بناتی ہیں۔“ صلہ نے فوراً یاد دہانی کروائی۔ ”اوہ اچھا.....“ انہیں بھی ہلکا ہلکا یاد آیا۔ اس سیریل میں انہیں اپنا کیا کام بالکل پسند نہیں آیا تھا۔ مگر یہ منظر جس جگہ فٹ کیا گیا تھا وہاں پر وہ کمال لگ رہا تھا۔ اس منظر میں کیمرہ ان کے چہرے پر مرکوز تھا۔ وہ لبوں پر ہاتھ رکھے آنکھ بند کیے کھڑی کچھ سوچ رہی تھیں۔ اور پھر کچھ کھودینے کے احساس کے خوف سے بند آنکھیں ایک جھٹکے سے کھلتی ہیں اور چند لمحے خاموشی سے ہنر اس پوزیشن میں کیمرہ کو تکتے رہنے کے بعد ان کی آنکھ بھر آتی ہے۔ منظر بہت قدرتی انداز میں فلمایا گیا تھا۔ گلیمرین کے استعمال کے بغیر ان کے آنسو نہ نکلنے کے باوجود وہ ہلکی نم آنکھیں مقابل کوڑا دینے کے لیے کافی تھیں۔ ان کے لیے وہ ویڈیو Nostalgia تھی۔ تقریباً ان کے ہر ڈرامے میں سے منظر نامے لیے گئے تھے۔ پل بھر کو وہ کھو سی گئیں صلہ ان کی کیفیت سمجھ سکتی تھی۔ شو بز جگہ ہی ایسی تھی یوں لگتا ہے کہ پوری دنیا مٹھی میں ہے مگر کچھ ہی عرصے بعد خاک تک ہاتھ سے پھسل چکی ہوتی ہے۔

ویسے آپ کا Cookery Show بھی کمال تھا۔ پشٹلی وہ قسط جس میں ساحرہ آپ کے شو میں آئی تھیں۔“ صلہ نے انکا دھیان ہٹانے کو مخاطب کیا۔ وہ جیسے کسی خیال سے لوٹیں اور آہستگی سے مسکرائیں مگر اگلے ہی پل وہ قسط تمام جزئیات سمیت یاد آ گئی تو وہ کھلکھلا کر ہنس دیں۔

”ارے وہ.....“ وہ ہنستی رہیں تو صلہ بھی ہنس دی۔ ”واقعی یادگار قسط تھی۔ آن سکرین کسی کے سر پر پیچ لگے تو یادگار رہی ہو جاتا ہے۔“ وہ محفوظ ہوئیں۔ وہ لکڑی کے ڈوئی تھی جسے ساحرہ زور سے ہلا رہی تھیں اور ڈوئی یکدم ڈنڈے سے جدا ہو کر ان کے ساتھ کھڑی زرینہ کے عین ماتھے پر جا لگی تھی اور پھر دونوں کا ہنس ہنس کر برا حال تھا۔ وہ بھی ایک منجھی ہوئی اداکارہ اور ہدایتکار تھیں۔ زرینہ کی ان سے بہت دوستی تھی۔ حالانکہ وہ عمر میں زرینہ سے خاصی بڑی تھیں۔ زرینہ کے فن کو نکھارنے میں ساحرہ کا بہت بڑا ہاتھ تھا۔ زرینہ اب ڈسکشن میں آ گئی تھیں جس میں ان کے اور دوسرے پرانے اداکاروں کے قابل اعتراض اور قابل ستائش منظر ناموں پر بھرپور تبصرہ کیا گیا تھا۔ اور لمبے بحث و مباحثے دلچسپ اور نتیجہ خیز تھے۔ زرینہ کو اس کے ذوق اور ایڈیٹنگ کے کام پر چابک دستی نے حیران کیا تھا۔

”لڑکی..... اس میں کتنا وقت صرف ہوا ہوگا۔ اتنی فارغ تم لگتی تو نہیں ہ۔“ زرینہ خاصی متاثر تھیں۔ ہر ایکٹیویٹی اور کوز میں اس کی

ذہانت جھلک رہی تھی۔

”اچھو نیلی مجھے ڈراموں کا خط ہے۔ جہاں اچھا کام نظر آیا اسے اپنی تخیلاتی سمجھ بوجھ سے اپنی مرضی سے استعمال کر لیا۔ اب دیکھیں نا تمام فنون لطیفہ کا مرکب ہوتا ہے ڈرامہ یا فلم..... شاعری، موسیقی، نغمہ، مصوری، اداکاری، رقص غرض ہر وہ آرٹسٹک چیز شامل ہوتی ہے جس سے انسان کو دنیا کی خوبصورتی، نرمی کا احساس ہوتا ہے ادب و لٹریچر نہ ہوتا تو ہر دور چنگیز خان، ہلاکو خان کا دور ہوتا۔“ صلہ نے کہا

”ہاں لیکن ہر کوئی آرٹ کی مشکل زبان بھی تو سمجھ نہیں پاتا۔ اور جب ادب عام آدمی کے لیے آسان بنا کر پیش کیا جاتا ہے تو پھر اس میں عامیاندہ پن آ جاتا ہے جیسے آج کل کے ڈراموں میں حقیقت پسندی شامل کرنے کی غرض سے بہت سی قابل اعتراض باتیں شامل کی جاتی ہیں جو خاصی افسوسناک ہے۔“ وہ مصروف سے انداز میں بولیں۔ ”آپ تو افلاطون والی باتیں کر رہی ہیں جس کے مطابق ادب ایک پاکیزہ گائے ہے۔

آج ادب خاصا بے ادب ہو چکا ہے کیونکہ ہمارا معاشرہ مادیت پسندی کی طرف مائل ہو چکا ہے۔ آرٹ کی خدمت کوئی نہیں کرتا، سب پیسے کمانے میں لگے ہیں۔ ہماری عوام ان دکھی اور مایوسی بھرے سانس بہو ساگا سے ٹکنا ہی نہیں چاہتی۔ نئے آنڈیا ز کو پزیرائی بھلا کیسے ملے گی جب کمرشل ہی نہیں ملیں گے۔ کیونکہ عوام سانس بہو والے رونے دھونے والے ڈرامے دیکھنے میں مصروف ہوتی ہے حالانکہ آپ کے دور کے ڈرامے بھی تو تھے۔

سادگی سے بھرپور، پھر بھی سبق آموز اور گہرائی لیے ہوئے۔“ وہ پرسوج انداز میں بول رہی تھی۔ زرینہ گہری سانس لیتی اثبات میں سر ہلایا۔ ایک اور دلچسپ ایکٹیوٹی نے انکی توجہ اپنی جانب مبذول کر لی تھی۔ ہلکی ہلکی بوند باندی شروع ہو چکی تھی۔ ہوا کے رخ کے باعث وہ سیدھی ان پر پڑ رہی تھی۔

زرینہ کو مصروف دیکھ کر وہ اپنی فائل سمیٹنے لگی۔ دونوں کو ہی وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوا۔ زرینہ جیسے پہلی بار اپنے کام سے متعارف ہو رہی تھیں۔ اپنے کام کی ایسی انوکھی پریزنٹیشن انہوں نے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ صلہ کے لیے بھی یہ تجربہ بہت خوبصورت تھا۔ زرینہ کو یوں قریب سے جاننے کا موقع کبھی ملے گا یہ تو اس نے خواب میں سوچا نہیں تھا۔ اپنے کام کے دوران وہ کئی سینئر اداکاروں سے مل چکی تھی مگر بارہا سکرین پر نظر آنے کے

باعث وہ سب ستارے جیسے اپنی چمک دمک کھو چکے تھے۔ زرینہ نے دس سال سے اداکاری نہیں کی تھی۔ وہ پردے کے پیچھے اپنے جوہر دکھانے میں مصروف تھیں۔ وقت کا احساس ہوتے نہ چاہتے ہوئے بھی انہوں نے لاگ آؤٹ کیا۔ اسے لیپ ٹاپ دے کر وہ کچھ دیر خاموش سی بیٹھی رہیں۔ صلہ لیپ ٹاپ آف کرتی باقی چیزیں اٹھا کر اٹھتے رک گئی۔ زرینہ بارش سے بے نیاز کسی سوچ میں گم تھیں۔ وہ واپس خاموشی سے بیٹھ گئیں۔ ”عرصے بعد مجھے اپنا کام دیکھنے میں لطف آیا۔ زندگی کے وہ 27 قیمتی سال کتنی جلدی گزر گئے۔“ وہ کھوئے ہوئے انداز میں گویا ہوئیں۔ پھر دھیرے سے مسکراتی

اس کی جانب مڑیں۔ ”تھینک یو سوچ فار ریماکنڈنگ می آل دس۔“ وہ جھپٹتا ممنون تھیں۔

”یو آر موسٹ ویلکم۔“ پھر اٹھ گئی۔ ”اسے میرے شوق کی تسکین ایک بہترین فنکار کو خراج تحسین پیش کرنے کی ادنیٰ سی کوشش سمجھیں۔“ بارش تیز ہو گئی تھی۔ ”چلیں؟“ وہ ایک ہاتھ میں فائل، دوسرے میں لیپ ٹاپ لیے کھڑی انہیں دیکھ رہی تھی۔ زرینہ بھی ایک نظر اسے دیکھتے اٹھ کھڑی ہوئیں۔

”کیا مصیبت ہے صلہ۔“ ہمانے جھنجھلا کر سٹیرنگ پر ہاتھ مارا۔ ”یہ والی دیکھو آدرش۔“ صلہ نے سکول سے نکلتی کوئی ساتویں خاتون کی طرف اشارہ کیا۔

”نی.....“ آدرش اب اکتار ہاتھا۔ پہلی سی گر مجوسی مفقود تھی۔ اس نے فرید بابا کے فون میں محفوظ صلہ کے نمبر پر کال کر کے سکول بلوایا تھا۔ اور صلہ نے یہی بیٹھے بیٹھے اس کی اماں کی تلاش شروع کر دی تھی۔ وہ مایوس سا ہو گیا۔

”او فوہ..... کیا پاگلوں کی طرح تفتیش کر رہی ہو۔“ پھر آدرش کی طرف مڑی۔ ”آپ کے پاپ اپنی می کی کوئی تصویر ہے؟“ اس کی بات پر آدرش کی روشن آنکھیں چمکنے لگیں۔ اپنے بیگ میں سے اس نے تصویر نکال کر اسے تھمائی۔ تصویر پر نظر پڑتے اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ لال جوڑے میں ملبوس انتہائی خوبصورت لڑکی کے ساتھ، بلیک ڈنرسٹ میں ملبوس سمارٹ سا نولانو جوان مسکرا رہا تھا۔ وہ چونکی اس شخص کی آنکھیں.....

”صلہ تیرا بیڑہ غرق جائے۔ تیرا لکھ نہ روے۔“ ہمدانت کچکا کر بولی تھی۔

”یہ والی دیکھو آدرش..... یہ ماڈرن سی خاتون۔“ وہ اس کے بولنے سے بے نیاز ہنوز کھڑکی کے شیشے سرٹکائے ایک اور خاتون کے بارے میں پوچھ رہی تھی۔

”نی ہے جے بی۔ آپ کو نی ملے گی ایسے“ وہ منہ پھلا کر بیٹھ گیا۔

”اولے مل جائے گی۔ یہ تو فرسٹ سٹیپ ہے۔ بعد میں.....“ صلہ ابھی بھی باہر دیکھنے میں مصروف اگلی حکمت عملی بتا رہی تھی۔

”ہمیشہ دشمنوں کی بچے اٹھا کے لاتی ہو۔ یونیورسٹی میں بھی کھڑوس ٹیٹی سر کے بیٹے کی ہمدردی میں پھنسوا دیا تھا۔ تمہاری جہ سے میری بھی تھیس میں نمبر کم لگے تھے۔“ وہ جو کب سے تصویر پر غور کر رہی تھی جل کر بولی اور تصویر غصے سے اس کے ہاتھ میں تھمائی۔

”اوہو کیا اول فول بکے جا رہی ہو۔“ تصویر پر نظر پڑتے اس کی بھی آنکھیں پھیل گئیں۔

”اللہ۔ کتنی خوبصورت لڑکی ہے ایمان سے۔ حسن کامل اف۔“ کاش میری سلچنگ اچھی ہوتی۔“ اس نے خدا کی قدرت کو سراہا۔ ”ذرا ان حضرت پر بھی نظر ڈالو۔“ ہمانے تنبیہ کرنا ضروری سمجھا۔

”کون یہ بالاجی.....؟“ اس نے اس کی سیاہی مائل سانوی رنگت پر چوٹ کی۔ تصویر پو واضح طور پر حور کے بغل میں لنگور کے مصداق تھی۔ دونوں خاصے کم عمر لگ رہے تھے۔

”ارے یہ تو.....“ اس نے غور کیا تو منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ اس کی وہی آنکھیں اس کے بالاج علی شاہ ہونے کا پتہ دے رہی تھیں ورنہ آج کے بالاج اور اس سمارٹ سے نوجوان میں واضح فرق تھا۔ اس نے مڑ کر بغور آدرش کو دیکھا۔ وہ ہوہو اپنی ماں کی کاپی تھا۔ اس نے بمشکل تھوک لگلا۔

”اب کیا کریں گے۔“ اس نے ہمارے مری مری آواز میں پوچھا۔

”خود ہی بھگتو۔“ ہمانے بے نیازی سے کندھے اچکائے۔ وہ چند لمحے سوچ میں پڑ گئی۔ ”تمہیں پتا ہے ہمارا آدرش فٹ بال کا میسٹ کھلاڑی ہے۔ ہم بھی تو کتنا کھیلتے تھے نا۔“ اس نے آنکھوں میں اسے اشارہ کیا۔ وہ گڑبڑا سی گئی۔ ”ہاں نا..... مجھے تو سپنری بنانی بھی آتی تھی۔ جلدی جلدی

میں اس نے بوگنی ماری۔ صلہ نے گھور کر اسے دیکھا۔

”وہ تو کرکٹ میں ہوتی ہے۔“ آدرش متعجب ہوا۔

”آدرش چلو فٹ بال کھیلنے چلتے ہیں۔ بڑا دل کر رہا ہے کھیلنے کا۔“ آدرش کا منہ لٹک گیا۔ ”مما کو کب ڈھونڈیں گے پھر۔“ ان دونوں نے ایک دوسرے کو یک بیک دیکھا۔

”ڈھونڈیں گے ناں۔ یہاں سکول میں تو وہ آئی نہیں۔ اگلی دفعہ کوئی اور پلین ٹرائی کریں گے۔“ صلہ کا انداز ٹالنے والا تھا۔ ”آپ مجھے میرے گھر چھوڑ دیں۔“ اس کے انداز میں حد درجہ مایوسی وہ دونوں محسوس کر کے رہ گئیں۔ ہمانے بیک و یو مرر سے اسے دیکھا۔

”ڈونٹ وری آدرش..... ہم تمہارے بابا سے ایڈریس پوچھ کر ان کے گھر چلے جائیں گے اور چپکے سے تمہیں بھی لے جائیں گے۔ تمہارے بابا کو پتہ ہی نہیں چلے گا۔“ ہما سے اس کی مایوسی دیکھی نہ گئی سودور کی کوڑی لائی۔ آدرش کا چہرہ کھل اٹھا تھا۔ ”ہاں! اگلی دفعہ جب ملیں گے تو تمہاری ماما کے گھر چلیں گے۔ مگر ابھی تو فٹ بال کھیلتے ہیں ساحل سمندر پر۔“ صلہ پر جوش ہوئی۔

”کیا..... اتنی سردی میں ساحل پر..... کوئی نہیں۔“ ہمانے جھرجھری لی۔ ”تو کیا تمہارے کمرے میں کھیلیں۔“ اس نے گویا اسے دھمکی دی۔ ریٹ ہاؤس یا سٹوڈیو کے قریب آدرش کے ساتھ تو وہ پھٹک بھی نہیں سکتے تھے اور نہ ہی تاپایا ماموں طرف جاسکتے تھے۔

”ویسے تو بہ ہے تمہاری والی..... لاہور کی سردی کے آگے یہ کوئی سردی ہے بھلا۔“ وہ چڑی گئی۔ ہما کو ضرورت سے زیادہ سردی کو سر پر سوار کرنے کی عادت تھی۔

”تمہیں تو لاہور میں بھی سردی نہیں لگتی۔ آخر شیلہ جو ہو۔“ ہمانے بھی بدل لیا۔ صلہ اسے گھور کر رہ گئی۔

”شیلہ کو سردی کیوں نہیں لگتی۔“ آدرش کے پوچھنے پر وہ دونوں چونکیں۔ اپنی بحث میں میں تو وہ سب بھول جاتی تھیں۔

بھئی جب برفباری اور برفانی ہواؤں میں جو مٹی سکرٹ پہن کر ڈانس کرے یا گانے گائے تو اسے کہاں سردی لگتی ہے۔“ ہمانے پھر سے شیلہ کی جوانی سے اسے چڑایا۔ صلہ نے اس کے بازو پر تھپڑ رسید کیا۔ ”بچے کا ہی خیال کر لیا کرو۔“ آدرش منہ کھولے انہیں دیکھ رہا تھا۔ صلہ آدرش کی جانب مڑی۔

”کیونکہ شیلہ بھی ساحل پر تیز سردیوں میں فٹ بال کھیلتی ہے اس لیے سوپر ہیومن بن گئی۔ اب اسے بالکل سردی نہیں لگتی اور ہر چیز وہ یوں چٹکیوں میں ڈھونڈ لیتی ہے۔“ صلہ کی اس عقل مندانہ بات پر ہما سر پیٹ کر رہ گئی۔ ایسی بات پر بڑے تو کیا بچے بھی متاثر نہ ہوں۔“ پھر مٹی مجھے مل جائیں گی! میں بھی سوپر ہیومن بن جاؤں گا۔“ اس کی معصومیت بھری آواز گونجی تھی۔ اس کی سوئی وہیں انکی تھی۔ ان دونوں یک بیک ایک دوسرے کو بے بسی سے دیکھا تھا۔ ”اس طرح Kick نہیں لگاتے۔“ وہ تینوں ساحل پر فٹ بال کھیل رہے تھے جب آدرش نے ان دونوں کو الٹی سیدھی Kicks

لگاتے ٹوکا۔ وہ ایک دوسرے کو بال پاس کر رہے تھے۔ وہ دونوں کک کسی جانب لگاتی تھیں اور بال چلی دوسری جانب جاتی تھی۔ آج صلہ جلدی میں اپنی کزن راحیلہ کے ہیل والی جوتی پہن آئی تھی۔ اس کے اپنے جوتے جانے کہاں غائب ہو گئے تھے۔ وہ آج کل

زیادہ تر تایا کے گھر ہی رہ رہی تھی۔ کیونکہ تائی اماں کو اس کے ہر وقت باہر رہنے پر خاصا اعتراض تھا۔ وہ بمشکل Kick مار رہی تھی۔ وہ ٹکونی شکل میں ایک دوسرے کو بال پاس کر رہے تھے۔ تبھی ہما کو توازن بگڑا اور وہ دھپ سے ریت پر جا گری۔ آدرش قدرے معذرت خواہانہ انداز میں دیکھ رہا تھا۔ کیونکہ اس نے خاصی زور سے کک لگائی تھی جسے پکڑنے کے چکر میں وہ ڈھیر ہو گئی۔

”heel میں نے پہنی ہے اور گرنے کا شغف تم فرما رہی ہو۔“ صلہ کھلکھلا کے ہنس رہی تھی۔ اسے ہنستا دیکھ کر آدرش بھی مسکرا دیا۔ خود نیچے گری ہما بھی زور سے ہنس دی۔ یک بیک تینوں کے قہقہے بلند ہوئے۔ ہما کپڑے جھاڑتے کھڑی ہو گئی۔

”بجواب تیری باری۔“ اس نے صلہ کی طرف زور سے بال کو کک لگائی۔ وہ تیار تھی سوچ گئی اور آدرش کی جانب بال بڑھا دی۔

”ویسے اگر اس کے ابا کو پتا چل گیا کہ ہم اس کی ماں کو ڈھونڈنے نکلے ہیں تو سوچو کیا حشر ہوگا ہمارا۔“ صلہ بولی تھی۔

”ہاں پتہ نہیں وہ کیسے ری ایکٹ کرے گا۔ مگر ایک بات ہے وہ اتنا برا نہیں ہے جتنا تم نے خوفناک نقشہ کھینچ رکھا ہے اس کا۔ ان فیکٹ میری تو بہت مدد کرتا ہے وہ۔“ وہ کھیلتے کھیلتے باتیں بھی کیے جا رہی تھیں۔

”ارے یہی توفن کاری ہے اس کی۔ تم سے پہلے زارا اور اس کے پہلے جتنی بھی خواتین اس کے ساتھ کام کرتی تھیں سب کے ایسی ہی مددگار کے پٹایا تھا اس نے۔ سکیئنڈلز سے بچنے کو سیٹ پر دوڑ رہتا ہے مگر جہاں پرائیویسی ملی ان سے اس کی بے تکلفی۔ الامان“ اس نے کانوں کو ہاتھ لگایا۔

”ایک دفعہ تو اتنی بے دردی سے ایک اسٹنٹ کی اس نے پٹائی کی تھی کہ ہم سب کے رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے۔ اپنی کولیگز کی مدد بھی صرف اسی لیے کرتا تا کہ سکرین پر کیمسٹری اچھی آئے۔“ اس نے آدرش کی جانب بال بڑھائی۔

”خیر مجھے کیا۔ مجھے تو بس کام کرنا ہے۔ کسی کے بھی ساتھ ہو۔ ویسے بھی مجھے تو لگتا ہے کہ لڑکیاں خود سے اسے لائن دیتی ہوگی۔ میں نے کبھی اسے خود سے کسی کو بلاتے نہیں دیکھا۔“ ہما ہانپتی بولی۔ آدرش اچھا خاصا پاؤں چلا لیتا تھا۔ ان دونوں کو خاصی بھاگ دوڑ کرنی پڑ رہی تھی۔ ان کا بچپن تو کرکٹ کھیلتے گزرا تھا۔ فٹبال کی تو ABC بھی معلوم نہ تھی۔ ہما یکدم ٹھٹھک گئی۔ ”تو اس نے خود کو اتنا ست کیوں رکھا ہوا ہے کہ بغیر کوشش کے کوئی بھی لڑکی چند دن کی رفاقت بھی پاسکے۔ بندے کا کوئی سٹینڈرڈ بھی تو ہوتا ہے۔“ ہما کی اڑی رنگت دیکھ کر وہ چونکی۔ ”کیا ہوا۔“ اس کے پوچھنے پر ہما نے پیچھے کی طرف اشارہ کیا۔ وہ مڑی تو بوکھلا کر رہ گئی۔ بالاج جانے کب اس کے پیچھے کھڑا خطرناک تاثرات لیے اس کی باتیں سن رہا تھا۔ وہ اتفاقاً ادھر آ نکلا تھا۔ اور آدرش کو دیکھ کر اس کی طرف آ گیا تھا۔ ”تو محترمہ اب آپ مجھے بتائیں گی کہ میرا سٹینڈرڈ کیا ہے؟“ وہ طنزیہ بولا۔ اس کا لہجہ برف جیسا ٹھنڈا تھا۔ صلہ کی ریزھ کی ہڈی میں سنسناتھٹ دوڑ گئی۔ اس کی نظروں کا تسخروں کا قلم تھا۔ کسی کے بارے میں رائے دینے سے پہلے انسان کو اپنی اوقات یاد رکھنی چاہیے۔“ وہ تسلی سے کہتا آگے بڑھ گیا۔ ”اوقات سٹارڈم نہیں، کردار ڈیسا بن کر رہتا ہے۔“ صلہ بھی تپ گئی۔ وہ یکدم مڑا تھا۔ ”اچھا کیا دیتا ہے یہ کردار یہ پارسائی ہاں؟“ وہ چہنچہ کرتے بولا تھا۔ ”کم از کم انسان اپنی نظروں میں تو سرخرو ہو سکتا ہے۔“ وہ استہزائیہ ہنستا قریب آیا۔ ”کیا مل گیا تمہیں اپنی نظروں میں سرخروئی پا کر۔ کیا پایا تم نے۔ کوئی Acheivement بھی ہے تمہارے پاس تمہارے نام کی؟“ اس کا تسخرو اڑاتا انداز صلہ کو اور ساگسا گیا۔

”میں آپ کو بتانے کی پابند نہیں ہوں۔“ اس کے سپاٹ انداز میں کہے جملے پر بالاج زور سے ہنسا تھا۔

”کوئی ہوگی تو بتاؤ گی نا۔“ اسے تپانے میں اسے لطف آرہا تھا۔ ”بڑی دیکھی ہیں تم جیسی سوکا لڈ کردار والیاں۔ ایک کمزور لمحے کی مار ہوتی ہیں بس۔“ اس نے چٹکی بجاتے مذاق اڑایا۔ اس کی خود کلامی خاصی اونچی تھی۔ ”آپ کو اب تک شاید اپنے جیسے ہی ملی ہوگی۔“ صلہ بھی نہ چوکی۔ ہما افتخار چہرہ لیے دونوں کو دیکھ رہی تھی۔ آدرش بھی نا کھچی کے عالم میں تک رہا تھا۔ ”میرے جیسید یہ تمہاری دوست بھی تو کھڑی ہے یہ میرے ہاتھوں سے کیسے بچ گئی۔ ماسٹڈ یو صلہ رحمان لڑکیاں اتنی بے اختیار اور معصوم نہیں ہوتیں کہ مرد کی دعوت کی نوعیت نہ پہچان سکیں۔“ وہ سنجیدگی سے بولا تھا۔ لاشعوری طور پر ہی سہی مگر وہ اسے اس کی اوقات یاد دلانا چاہتا تھا۔

”جو شخص عورت نامی کتاب کو شروع ہی آخری صفحے سے کرتا ہو بھلا“ صلہ بول بھی نہ پائی تھی کہ وہ بول اٹھا۔ ”عورت کوئی کتاب و کتاب نہیں ہے اور جو سمجھتے ہیں وہ صرف وقت ضائع کرتے ہیں۔ ان کو سمجھنے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ بس انہیں سرا ہو خود ہی پکے آموں کی طرح جھولی میں آگرتی ہیں۔“ وہ استہزائیہ مسکراہٹ لیے اسے دیکھ رہا تھا۔ صلہ کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا تھا۔

”یہی بات کوئی آپ کی بیٹی کے لیے کہے تو“ بالاج کی مسکراہٹ یکدم غائب ہو گئی۔ ”شٹ اپ یو بلڈیڈ“ بے اختیار ہی اس کا ہاتھ ہوا میں بلند ہو گیا تھا۔ ہما تیزی سے آگے بڑھی۔

”یہ آپ کیا کر رہے ہیں بالاج۔ کم از کم آپ سے اتنے شارٹ ٹیمپر کی امید نہیں تھی مجھے۔“ اس نے صلہ کو پیچھے کھینچا۔ وہ خونخوار نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ صلہ بھی برہم نگاہوں سے اسے تک رہی تھی۔

وہ تن فن کرنا آدرش کی جانب بڑھا اور تقریباً گھسیٹے اس کا ہاتھ پکڑے لے جا رہا تھا۔ آدرش چھوٹے چھوٹے پاؤں تیزی سے اٹھاتا بمشکل اس کا ساتھ دے پارہا تھا۔ ارد گرد سے گزرتے لوگ عجیب سی نظروں سے انہیں دیکھ رہے تھے۔

”تمہارا منہ نہیں رہ سکتا..... وہ ہاتھ اٹھا دیتا تو کیا عزت رہ جاتی تمہاری۔“ ہما غصے سے اسے کھینچ کر لے جا رہی تھی۔

’د بات نہیں سنی تم نے اس کی..... سمجھتا کیا ہے خود کو۔ بڑا آیا نام کروڑ کہیں کا۔“ وہ چڑ کر بولی تھی۔

”ایسے لوگوں کا Avoid کرنا سیکھو۔ ورنہ کہیں کی نہیں رہو گی۔“ ”بھاڑ میں جائے۔ میں کیوں ڈروں اس سے۔ دیکھا نہیں تم نے کیسے چیلنج کر رہا تھا مجھے۔ سز مل کہیں کا۔“ وہ دونوں کمرے میں داخل ہو گئی تھیں جب ہما نے اسے گھر کا۔ ”اچھا اب چپ کر جاؤ۔ جو ہوا اس کا ذکر کرنے کی قطعی ضرورت نہیں ہے۔“

”مجھے کوئی شوق نہیں ذکر کرنے کا وہ بھی اس فضول آدمی کا۔ نیور۔“

وہ بیڈ پر منہ پھلا کر بیٹھ گئی۔ سارا موڈ غارت ہو گیا تھا۔



ندیا گنلتی کا من روم میں داخل ہوئی۔ ہمارے صوفے پر بیٹھی تھی۔

”ہیلو میڈم..... کیا ہو رہا ہے۔“ وہ خوشگوار سے انداز میں اس کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔

”کیا ہوا؟“ اسے ہنوز بے نیاز فائل کے صفحات سے کھیلتے دیکھ کر وہ چونکی۔ ”ڈانٹ پڑی ہے کیا پھر سے۔ کم آن یہ تو عام سی بات ہے۔

پھر تمہاری پہلی جاب ہے۔ ڈانٹ تو پڑے گی ہی۔ وہ خوشگوار سے انداز میں سے کہتی بولی۔ ہمارا کی اکثر نسیم بادی سے ڈانٹ پڑ جاتی تھی۔ اور پھر وہ یونہی منہ پھلا کر بیٹھ جاتی تھی۔

”نہیں یا ڈانٹ تو نہیں پڑی۔ صلہ کہاں ہے؟“ ہمارے سپاٹ سے لہجے میں کہنا تھا کہ ”یہ تو قدرے چونک گئی۔“ ضرور کوئی پریشانی کی بات تھی۔

”بھئی صلہ کہاں ہوگی۔ ظاہری سی بات ہے زریں کے پاس ہی ہوگی۔ ویسے بھی وہ محترمہ آج کل ہواؤں میں رہتی ہیں اور جب کبھی زمین

کارخ کریں تو سیدھا زریں کے Cats & Dogs ہاؤس میں پائی جاتی ہیں۔

ایمان سے اس کی تو آج کل پانچوں انگلیاں گھی میں اور سر کڑا ہی میں ہے۔ زریں سے دوستی بھی ہو گئی اور خوب کام بھی سیکھا جا رہا ہے۔“

وہ کھلکھلائی بولی تو ہمارا چپکی سی ہنسی ہنس دی۔

”دبھی اب بتا بھی چکو کیا پریشانی ہے۔ ڈونٹ وری کسی کو نہیں بتاؤں گی۔“ ہمارے ایک پریشان سی نظر اس پر ڈالی۔ وہ متذبذب سی تھی اور

شیر کے بغیر تو ویسے بھی اس کی پریشانی کم نہیں ہوتی تھی۔

”وہ اعفان نے میرے گھر پر پوزل بھیجا ہے۔“ وہ آہستگی سے بولی۔ تو ندیا بھونچکی رہ گئی۔ اس کی رنگت یکدم بدل گئی۔ ”امی کا فون آیا

تھا بھی۔“ ”کیا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے تم لوگوں کی تو کبھی ڈھنگ سے بات بھی نہیں ہوئی پھر کیسے۔“ وہ حقیقتاً حیران تھی۔

”شاید صلہ ٹھیک ہی کہتی تھی۔ اس شخص میں حسد کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ لوگوں کو میرا اور بالاج کی جوڑی بہت پسند آئی ہے اور وہ

مرکزی کردار ہوتے ہوئے بھی لائم لائن میں نہیں آیا۔ سو یہی سوچا ہوگا کہ اسی بہانے ہماری آن سکرین کیمسٹری کا کریم ختم ہوا اور لوگ اصلی جوڑی

پر غور کرنا شروع کر دیں گے۔“ وہ بڑے متوازن لہجے میں بول دیں تھی۔ جیسے بڑی معمولی بات ہو۔

”صلہ کو تم رہنے دو۔ فضل افلاطونی تبصرے کرتی ہے میں اعفان کو بہت پہلے سے جانتی ہوں وہ ایسا نہیں ہے۔ وہ بالکل ایسا نہیں ہے۔“

ندیا کے عجیب سے انداز میں کہنے پر وہ ٹھکی۔ اس کے چہرے پر عجب شکست خوردہ سا تاثر تھا۔

”خیر جو بھی ہے۔ میں نے اسے بڑے واضح انداز میں شیر کی بارے میں بتا کر معذرت کر لی ہے۔ اصل مسئلہ تو یہ ہے کہ اس دفعہ امی

جان مجھے بخشے کے موڈ میں نہیں ہیں۔ اس سے تو جان چھوٹ گئی مگر اب اگر کوئی پروپوزل آیا تو امی مجھ سے پوچھنے کا بھی تردد نہیں کریں گی۔ اور شیر

سے رابطہ ہی نہیں ہو پارہا۔“

یہ اتفاق ہی تھا کہ صلہ اسے شیر کی واپسی کا بتانا بھول گئی تھی۔ ویسے بھی وہ ماں باپ کو منانے کے لیے آ رہا تھا۔ ہمارے بارے میں اس

نے کوئی بات نہیں کی تھی۔ اور یہی وجہ تھی کہ اس کی امی نے ہمارے والدین کو بھی نہیں ابھی اس کی واپسی کی اطلاع نہیں دی تھی۔ کہ ابھی ڈیٹ فائل نہیں

تھی اور وہ انہیں جھوٹی تسلی نہیں دینا چاہتی تھی۔

”تو ٹھیک ہے نایار آخر کب تک انتظار کرو گی۔ اسے آنا ہوتا تو کب کا آچکا ہوتا۔ یا پھر کم از کم رابطہ تو رکھتا۔“ ندیا بھی سنبھل گئی تھی۔ ”اور پتہ نہیں اس نے وہاں کتنی شادیاں کر لی ہوں۔ نیشنلسٹی کے لیے تو لوگ کچھ بھی کر سکتے ہیں۔“

”ایسا نہیں ہوگا۔ مجھے پتا ہے ایسا نہیں ہوگا۔“ وہ پراعتقاد تھی۔ ندیا نے تاسف سے سر ہلایا۔

”پتہ نہیں کن فیری ٹیلز میں رہتی ہو تم۔ مجھے تو یہ سب دن سائیڈ ڈگتا ہے۔ اسے تم سے محبت ہوتی تو کوئی تو امید دلاتا وہ ہمیشہ ٹالنے والی بات کرتا ہے۔ اور فرض کرو اگر اس نے واقعی وہاں شادی کی ہوئی تو کیا معاف کر پاؤ گی اسے کبھی۔“ وہ جانچنے والی نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر عجب پڑ مرزدگی سی چھائی تھی۔ ”بچپن کی محبتیں اتنی کمزور نہیں ہوتیں۔ ندیا۔ آکاس ہیل کی طرح ہمارے اندر تک دور دور تک اس کی جڑیں پھیلی ہوتی ہیں۔“ ہمارے چہرے پر عجب رنگ پھیلے تھے وہ دیکھ کر رہ گئی۔ بھلا آج کے زمانے میں کون کسی کا اتنا انتظار کرتا ہے۔

.....☆.....

سیٹ پر غیر معمولی ہلچل تھی۔ زرینہ نے سب کو آگے لگایا ہوا تھا۔ ڈیڈ لائن قریب تھی اور کام خاصا بکھرا پڑا تھا اور اس کی واحد وجہ بھی زرینہ کی اپنی کامیلت پسند فطرت تھی۔

”یہ سٹول ابھی تک ادھر پڑا ہے۔ کیا کر رہے ہو تم شجاع۔ ہزار دفعہ کہا ہے.....“ وہ اسٹنٹ کو ڈانٹتے یکدم رکیں۔ ”لاحول ولا قوۃ۔“ ان کے قریب ہی دلخراش قسم کی چھینک نے انہیں دل تھامنے پر مجبور کر دیا۔

انہوں نے مڑ کر کسی بھاری بھر کم مرو کی تلاش میں نظر دوڑائی مگر پیچھے کھڑی سرخ ناک لیے معصومیت سے انہیں دیکھتی صلہ کو دیکھ کر حیران ہوئیں۔ نرم و نازک سے سراپے کی مالک صلہ سے انہیں ایسی انرجی کی امید نہیں تھی۔ ”یہ چھینک تم نے ماری ہے۔“ وہ ہاتھ کے اشارے سے اسٹنٹ کو بھیجتی اس کی طرف بڑھیں۔ اس نے سر اثبات میں ہلایا۔ ”وہی ڈسٹ الرجی۔ تائی اماں کی نظروں سے بچ کر نکلی تھی اور سزا بھی مل گئی۔“ اس نے برا سامنہ بنایا۔ ڈونٹ وری میڈ یس لے لی ہے۔ تھوڑی دیر تک ٹھیک ہو جائے گی۔ زرینہ مسکرائی اسے ساتھ لیے آگے بڑھیں۔

”یہ الرجی کی دوائی کب سے ایجاد ہو گئی۔“

”الرجی کی دوائی نہیں لی۔ فلو کی لی ہے ورنہ یہ چھینکیں ایسے ہی ذلیل کرواتے ہیں۔“ وہ دونوں فریم ایریا کی جانب آگئے۔ جہاں زارا کے لیے سین تیار تھا۔

”ویسے تمہاری صحت اور ان چھینکوں کے حجم میں زمین آسمان کا فرق ہے۔“ وہ خوشدلی سے بولیں۔

”میں تو خوف کے مارے ڈسٹی ایریا سے گزرتی بھی نہیں مگر آج کنسٹرکشن سائیڈ سے رکشے والا لے آیا۔ سوہستی تو یقینی تھی۔“ وہ ناک پونچھتے بولی۔

”سوہستی.....؟“ زرینہ متعجب ہوئیں۔

”جی سویٹ انسلٹ..... میری حالت پر لوگ ترس کھاتے ہیں اور پھر پیچھے ہٹتے ہیں۔“

اس نے بمشکل چھینک روکی۔ زرینہ کھلکھلا دیں۔

”جاؤ تم آرام کرو۔ شام کو صدیقی صاحب کو نریشن دینا ہے اور یہ کام تم ہی کرنا ہے۔ شجاع تو نکما ہے بالکل۔“ وہ ڈائریکٹر چیئر پر بیٹھ

گئیں۔ ذرا آگئی تھی۔ وہ سر ہلاتی کا من روم کی جانب چل دی۔

شام ڈھل رہی تھی مگر کام ویسے سہی ہو رہا تھا۔ وہ نریشن دے کر فارغ ہوئی تو زرینہ کہیں سیٹ پر نظر نہیں آئی۔ وہ یونہی کمرہ مین مسعود

کے پاس آگئی اور آج کی ریکارڈنگ دیکھنے لگی۔ آج شارٹس حسب معمول جاندار تھے۔ زرینہ کا کام کرنے کا انداز نسیم بادی سے قدرے مختلف تھا۔

کسی ایکٹر کم ڈائریکٹر کے ساتھ کام کرنے کا اس کا پہلا تجربہ تھا۔ زرینہ اکثر اسے اداکاری کے اسرار و رموز سے آگاہ کرتی تھیں۔ ان کے مطابق ہر

انسان میں ایک اچھا اداکار چھپا ہوتا ہے۔ مگر ان کے بقول صلہ سے زیادہ فلاپ اداکارہ انہوں نے آج تک نہیں دیکھی تھی۔ خود صلہ بھی بخوبی اپنے

کارناموں سے واقف تھی سوان کی کوششوں کو خوب ناکام کرنے میں لطف اندوز ہوتی تھی۔ تمام یونٹ والے قدرے بیزار آگئے تھے۔ کیونکہ زرینہ

حسب منشا شارٹ نہ ملنے تک سب کی جان سولی پر لٹکائے رکھتی تھیں۔ مگر ابتدائی اقساط کے بہترین ریپانس کے باعث وہ خوش بھی تھے اور تھکاوٹ

کے باوجود لگن سے کام کر رہے تھے۔ اس پروجیکٹ سے تقریباً سبھی کروار الگ حیثیت سے جانے جا رہے تھے۔ مسعود سے کچھ کہتی وہ ٹھٹھک کر رکی

تھی۔ اس کے عقب میں کوئی کھڑا تھا۔ اس شخص کی آواز سن کر بے ساختہ ایک ہارٹ بیٹ مس ہوئی تھی۔ اس کے قدم بے ساختہ اس طرف بڑھے۔

اسے جاتا دیکھ مسعود بھی اپنے کام میں لگ گیا۔ رف سی کھلی ٹی۔ شرٹ اور سپورٹس ٹراؤزر میں بلبوس اس شخص کی پشت اس کی جانب تھی۔ وہ انہیں

لاکھوں میں بھی پہچان سکتی تھی۔ ”یوسف ثانی..... آپ یہاں؟“ وہ یکدم ان کے عقب میں کھڑی ہوئی۔ وہ (جمال یوسف) چونک کر مڑے۔ ان کے

چہرے پر خوشگوار حیرت کے تاثرات تھے۔



کام آخری مراحل پر تھا۔ چند دن کا کام تھا پھر زرینہ اپنی فلم میں مصروف ہو جائیں اور وہ اپنے کاموں میں۔ جمال یوسف سے ملاقات

کے بعد وہ کئی دن زرینہ سے ملنے نہیں آئی۔ آج زرینہ کے اصرار پر وہ نہ چاہتے ہوئے بھی چلی آئی تھی۔ اب اسے اپنے مسودے پر کام کرنا تھا لہذا

آج آخری بار سب سے ملنے چلی آئی تھی۔ ندیا سے ملتے وہ سیدھی ہما اور اس کے مشترکہ کمرے کی جانب بڑھ گئی۔ دروازہ چوہٹ کھلا تھا۔ ہما چیئر پر

ٹانگیں سمیٹ کر بیٹھی میگزین میں گم تھی۔ جبکہ ندیا بیڈ پر بیٹھی زار و قطار رو رہی تھی۔ وہ گھبرا کر آگے بڑھی۔ ”تمہیں کیا ہوا ہے؟“ وہ بیڈ پر آ بیٹھی۔ وہ ہنوز

ہچکچایا لیتی رو رہی تھی۔

”میں نے اعغان کو پروپوز کر دیا۔“ ہچکیوں کے بیچ ابھرنے والی آواز نے صلہ کی سیٹی گم کر دی۔ ”دماغ خراب ہو گیا تھا کیا؟“ وہ منہ

کھولے اسے دیکھ رہی تھی۔ وہ تپ گئی۔ ”کیوں کیا خرابی ہے اس میں۔ میں نے سوچا جانے پھر ملاقات ہونہ ہوا بھی وقت ہے بتادوں۔“ وہ اور زور

سے رونے لگی ”مگر اس نے صاف انکار کر دیا۔“ ”کہتا ہے اسے کوئی اور پسند ہے۔“ اب کے ہما نے میگزین سے سر اٹھایا۔ ”اسے تو روز کوئی نہ کوئی نئی

لڑکی پسند آتی ہے۔ فکر نہ کرو تم بھی کسی دن اچھلنے لگ پڑو گی۔“ اس کے بے نیازی سے دیے مشورے پر صلہ کی ہنسی چھوٹ گئی۔ ندیا جل کر رہ گئی۔ ”یہ

دیکھو۔ کب سے ایسے ہی میرا دل جلانے جارہی ہے۔“ صلہ نے ہنسی ضبط کرتے پانی کا گلاس اس کی طرف بڑھایا جو اس نے نہیں لیا۔ تو وہ کندھے اچکاتی خود گھونٹ گھونٹ کر کے پینے لگی۔

”ویسے ندیا تم کبھی ماضی سے سبق نہیں سیکھتیں۔ پہلے بھی کوئی دس دفعہ میں تمہیں ایسے ہی بیٹھے تسلی دیتے رہی ہوں۔ قسم سے یہ سین بڑا گھس گیا۔ کبھی آکاش، کبھی مدثر، کبھی عابد“ وہ بڑے مزے سے نام گنوانے بیٹھ گئی۔ ہما سب سے بے نیاز میگزین پر جھک گئی۔ ندیا نے بڑی ملا متی نظروں سے اسے گھورا تو وہ کھسیا کر چپ ہو گئی۔

”پسند کا اظہار کرنا کوئی گناہ تو نہیں ہے۔“ اس نے احتجاج کیا۔

”ہاں اگر ایک ہی ہو تو کوئی گناہ نہیں ہے۔ روز روز تو پسند بدلتی ہے تمہاری اچھا خاصا لڑکا تھا وہ کیا نام تھا بھلا سا اس کا؟ وہ یاد کرنے کو رُکی.....“ ”خاور.....“ ہما نے یاد دلایا۔ ندیا نے کھا جانے والی نظروں سے ان دونوں کو دیکھا۔ ”میں تم دونوں کو اپنا دوست سمجھتی تھی۔ کب سے مذاق اڑا رہے ہو میرا۔“

”دوست ہیں تو مشورہ دیتے ہیں تمہیں مگر تم سنتی کہاں ہو۔ خیر اب اس فضول آدمی کو کون بد نصیب پسند آگئی۔“ اس نے بات بدلنے کو یونہی پوچھا۔ اور پھر گلاس لبوں سے لگا لیا۔ رو رہی تھی اور پیاس اس کو لگ رہی تھی۔

”بقول تمہارے بد نصیب لڑکی جو اسے پسند آئی ہے وہ تم ہو۔“ وہ تڑخ کر بولی اور پھر بھان بھان رونے لگی۔ صلہ کہ زور کا اچھو لگا۔ وہ بری طرح کھانس کر رہ گئی۔ پھر ایک نظر اسے اور ہما کو دیکھ کر یکدم ہنس پڑی۔

”اس کا مطلب ہے وہ واقعی تم میں انٹرنلڈ نہیں ہے اسی لیے میرا نام استعمال کر کے جان چھڑوا رہا ہے۔ چل بیٹا کہیں اور ٹرائی کر۔“ وہ ہنستے کہتی اٹھ گئی۔ ہما بھی نفی میں سر ہلاتی مسکرا رہی تھی۔

”وہ تو روز کوئی نہ کوئی نیا شوٹا چھوڑتا ہے۔ اس میں کیا نیا ہے۔“ ہما کے انداز پر وہ ٹھکی۔ کسی زمانے میں وہ اعفان باری کے پرستاروں میں سے تھی۔ ”آج کل زرینہ کے گرد بہت گھوم رہا ہے۔ فل آن چا پلوسی۔ تاکہ فلم میں چانس بنے اس کا۔“ ہما نے گویا اپنی طرف سے دھماکا کیا۔ مگر صلہ نے کوئی خاص رد عمل کا اظہار نہ کیا کندھے اچکاتی بولی۔ ”وہ میرٹ پر فیصلہ کرتی ہیں۔ انہیں صحیح لگے گا تو وہ یونہی اسے لے لیں گی۔ ویسے بھی انہوں نے ابھی کاسٹنگ شروع نہیں کی۔“ ہما نے تاسف سے اسے دیکھا۔

”چرچہ..... میں نے سوچا تھا تمہیں عقل آگئی ہوگی اب تک۔ آخر کب تک کنویں کا مینڈک بنی رہوگی۔ اعفان کو ڈائریکٹر کے لیے ٹرائی کر رہا ہے کیونکہ مرکزی کردار پہلے سے ہی زرینہ کی نظر میں ہیں اور تم جانتی ہو اعفان باری اداکار ہونے کے ساتھ ہدایتکاری میں بھی تجربہ رکھتا ہے۔ اچھا خاصا چانس تھا تمہارے پاس زرینہ کہ اپرٹس کرنے کا۔“ ہما کے بے تاثر لہجے میں کی گئی بات پر دروازے تک جاتی صلہ متحیر رہ گئی۔

”کیا مطلب ہے تمہارا؟ تم مجھے ایسا سمجھتی ہو۔ اتنا عرصے کے دوستی کے بعد بس اتنا ہی جان پائی ہو تم مجھے۔“ وہ متاسف سی نظر اس پر ڈالتی باہر نکل گئی۔ ہما سر جھٹکتی کرسی سے اٹھ گئی۔ ”ایموشنل فول۔“ اس کے بڑبڑانے پر ندیا بھی چوکی تھی۔

”پروڈیوسر نے تمہیں چوائس دی ہے۔ ایک دفعہ پھر سوچ لو۔ کسی تجربہ کار کو بروئے کار لاؤ۔ بچے کیا کریں گے۔“ جمیل متفکر سے تھے۔
 ”یہی بچے ہمارا فیوچر ہیں اور ویسے بھی بالکل نا تجربہ کار تو نہیں ہے۔“ ڈونٹ وری میں نے میرٹ پر ہی فیصلہ کیا ہے۔“ وہ تسلی سے بولیں۔ تو وہ گہرا سانس لیتے باہر کو بڑھے۔ دفعتاً دروازے پر دستک ہوئی۔ گلاس ڈور کے اس پار صلہ کو کھڑے دیکھ کر انہوں نے مسکراتے اجازت دی۔ جمیل شفقت سے اس اس کا سلام کا جواب دیتے باہر چلے گئے۔

”آؤ ابھی صلہ..... تم تو مہمان ہو گئی ہو۔ سو فون کرنے پڑت ہیں اب میڈم کو بلانے کے لیے.....“ زرینہ خوشگوار انداز میں شکوہ کیا تو صلہ مسکرا دی۔

”اب ایسا بھی نہیں ہے۔ ایک ہی تو فون کیا تھا آپ نے۔“ صلہ مسکراہٹ دبائے بولی۔ زرینہ نفی میں سر ہلاتی مسکراتے میز پر پڑی چیزیں سمیٹ رہی تھیں۔ زرینہ میز پر جانے کیا کیا پھیلائے بیٹھی تھیں۔ سمیٹتے سمیٹتے وہ خود بھی وحشت زدہ سی ہو رہی تھیں، صلہ سامنے پڑی کرسی پر جا بیٹھی۔ اور بغور انہیں دیکھنے لگی۔

”کیا بات ہے ابھی..... آج ایسے دیکھ رہی ہو جیسے پہلی بار دیکھا ہے۔“ وہ اس کی محویت بھانپتے مصروف سی بولیں۔
 ”دیکھ رہی ہوں کہ انسان میں ایسی کیا خاصیت ہوتی ہے جو کسی کو صدیوں تک سحر زدہ کیے رکھتی ہے۔“ وہ عجیب سے لہجے میں بولی تھی۔
 زرینہ دھیرے سے مسکرائیں۔

”ڈونٹ وری میں خود بھی جمیل اختر سے آج تک سحر زدہ ہوں۔ اور اس سحر کو عام زبان میں محبت کہتے ہیں جناب۔“ ان کا موڈ بہت خوشگوار تھا۔

”میں جمیل انکل کی بات نہیں کر رہی۔“ اس کے بے تاثر سے انداز پر وہ چونکیں۔ ”کیا مطلب؟“ ”مطلب یہ کہ جمال یوسف سے ایک ملاقات کے بعد انسان کا موڈ اگلے چار پانچ دن تک عجیب و غریب ہی رہتا ہے۔ یہ جوگی اور روگی ٹائپ لوگ اتنی عجیب باتیں کیوں کرتے ہیں۔“ وہ بڑے عام سے لہجے میں پوچھ رہی تھی۔ زرینہ لمحے بھر کو چپ سی ہو گئیں۔
 ”تم کیسے جانتی ہو انہیں؟“

”ان کی ایجنٹ ہوں۔ آپ کی فلم ستایا ناس کرنے آئی ہوں۔“ وہ سنجیدگی سے انہیں گھور رہی تھی۔ زرینہ ہکا بکارہ گئیں۔ پھر آہستگی سے سر جھٹکتی بولیں۔ ”ی“ اگر یہ بات جمال خود آ کر کہیں تو بھی میں نہیں مانوں گی۔“ وہ دو ٹوک انداز میں بولیں۔ ”اتنا یقین ہے مجھ پر؟“ صلہ حیران ہوئی۔
 ”ہاں تم پر بھی اور لوگوں کو پہچاننے والی اپنی حس پر بھی۔“ وہ مسکرائیں۔ ”ہر بار آپ کا تجزیہ درست ہو ضروری تو نہیں۔ انسان بڑی حیرت انگیز چیز ہے آپ مکمل طور پر اسے جاننے یا سمجھنے کا دعویٰ نہیں کر سکتے۔“ صلہ بھی دو بدو بولی تھی۔ زرینہ نے ابرو اچکاتے نفی میں سر ہلایا۔ ”آج تک تو غلط ثابت نہیں ہوا۔“ وہ ڈرار کی جانب جھکیں۔ اور اس میں سے ایک فائل نکال کر میز پر رکھ دی۔

”آپ نے پوچھا نہیں میں جمال یوسف کو کیسے جانتی ہوں؟“ صلہ کے بولنے پر زرینہ قدرے چونک گئیں۔ پھر فوراً سنبھل کر

مسکرائیں۔“ تمہارے نسیم انکل بڑے کام کی چیز ہیں۔ یقیناً انہوں نے ہی ملوایا ہوگا۔ ان سے کافی دوستی ہے جمال کی۔“
 ”دوستی تو آپ کی بھی بہت تھی ان سے۔“ صلہ کے برجستہ کہنے پر وہ ٹھٹھکیں۔ ”ہم نے کافی کام اکٹھے کیا ہے۔ ظاہری بات ہے۔“ وہ فائل
 تھامتے نارٹل سے انداز میں گویا تھیں۔

”جمال سر سے آپ کی دوست ٹوٹنے کی کوئی خاص وجہ؟“ وہ آج ملنے کے موڈ میں نہیں تھی۔ زرینہ گہری سانس لے کر رہ گئیں۔
 ”جو بھی وجہ تھی Thats none of your concern۔“ وہ خاصی زچ آگئی تھیں۔ ”کوئی شخص پچیس سال سے آپ کا روگ
 لگائے ساری دنیا میں خوار ہوتا پھر رہا ہے۔ کسی غیر کو بھی ان کی حالت پر ترس آجائے۔ مگر آپ نے ان پر ایک کیٹھلک کو ترجیح دے دی۔ صرف اس
 لیے کہ ان دنوں آپ پر دین اسلام کی تبلیغ و ترویج کا شوق چڑ آیا تھا.....“

”سٹ اپ صلہ..... جسٹ سٹ اپ“ ان کے زور سے فائل میز پر پٹختے پر صلہ کی زبان کو بریک لگے تھے۔ مگر آنکھوں میں ان کے لیے
 درستی ابھی بھی قائم تھی۔ ”تمہیں کوئی حق نہیں پہنچتا کہ تم کسی کی ذاتی زندگی پر اپنے فضول اندازے صادر کرو۔ تم کچھ نہیں جانتیں۔“ وہ بمشکل ضبط کیے
 بولی تھی۔ صلہ کے چہرے پر کوئی شرمندگی نہیں تھی۔ انہوں نے چند گہرے سانس لیے تو خود کو کمپوز کرنے کی کوشش کی۔ چند لمحے وہ یونہی سر تھامے بیٹھی
 رہیں۔ صلہ خاموشی سے انہیں دیکھ رہی تھی۔

”ٹیلی ویژن کے اس سنہرے دور میں ہم آٹھ لوگوں کا گروپ خاصا فعال تھا۔ ایک دوسرے کی خوشی غمی میں سب ساتھ ساتھ تھے۔ جمال
 اس زمانے میں بھی ایسی ہی خانہ بدوش طبیعت کا مالک تھا۔ اس کا دل کبھی ایک چیز پر ٹھہرتا نہیں تھا۔ مگر میرے لیے اس کے جذبات کسی سے چھپے نہیں
 تھے اور نہ اس کے کبھی چھپائے تھے۔ تم یقین کرو گی کہ میری اور جمیل کی شادی پر گروپ کا ایک بھی بندہ شریک نہیں ہوا تھا۔ سب مجھے جمال کا مجرم سمجھتے
 تھے۔ جبکہ میں نے کبھی اس کی پذیرائی نہیں کی تھی اس کے باوجود اس وقت سب نے مجھے مورد الزام ٹھہرایا اور آج تم بھی انہی لوگوں میں شریک ہو گئی
 ہو۔“ وہ دُکھی سے لہجے میں بولی تھیں۔ صلہ کی اس بات نے انہیں بہت ہرٹ کیا تھا۔ جبکہ صلہ سر جھکائے ہنوز خاموش بیٹھی تھی۔

”مجھے نہیں پتا تھا کہ تم مجھے ایسا سفاک سمجھتی ہو۔“ ان کے آہستگی سے کہنے پر صلہ نے سر اٹھایا تھا۔ ”میں آپ کو بالکل ایسا نہیں سمجھتی زرینہ۔
 بلکہ میں آپ کو برا سمجھ ہی نہیں سکتی۔ اس شخص نے ساری زندگی آپ سے محبت کی ہے اور میں نے اس سے۔“ اس کے شکست خوردہ سے انداز پر زرینہ
 بوکھلا کر رہ گئیں۔ چند لمحے وہ کچھ بول ہی نہ پائیں۔

”صلہ یہ صرف وقتی کشش ہے جسے تم محبت سمجھ رہی ہو۔ بے شک جمال ایک ساحر شخصیت کا مالک ہے۔ مگر یقین کرو اس میں اور بالاج علی
 شاہ میں صرف انیس بیسیں کا فرق ہے۔“ ان کے انکشاف پر صلہ نے بے یقینی سے انہیں دیکھا تھا۔ زرینہ نے نہنگلی سے سر کو اثبات میں جنبش دی۔
 ”وہ باتیں اچھی کرتا ہے۔ تمہارے آئیڈیل پر کھرا اترتا ہے۔ صرف اسی لیے تم اپنے آئیڈیلز کو محبت سمجھ بیٹھتی ہو۔“

ان کا لہجہ خلوص سے پُر تھا۔ صلہ نے نشی میں سر ہلایا تھا۔

”نہیں زرینہ۔ میں نے اپنے جذبات کو ہر سوٹی پر آزما کر دیکھا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ میں انہیں سے محبت کرتی ہوں اور جہاں تک ان

کے کردار کی بات ہے تو مجھ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ”وہ شکستگی سے مسکرائی۔“ محبت میں خود پر بس ہی کہاں چلتا ہے جو باقی چیزوں کے بارے میں سوچ سکیں۔“ زرینہ بے بس سی اسے دیکھتی رہ گئیں۔ وہ حقیقتاً چاند کی تمنا کی تھی۔ لا حاصل در لا حاصل۔ وہ گھر بسانے والا آدمی نہیں تھا۔ وہ صلہ کے لیے از حد دکھی ہوئیں۔ دفعتاً ان کی نظر میز پر پڑی فائل پر پڑی تو اچانک جیسے انہیں کچھ یاد آیا تھا۔

”تم بھی نا صلہ..... ادھر ادھر کی باتوں میں اصل کام بھلا دیتی ہو۔ یہ فائل پکڑو۔“ انہوں نے فائل اس کی طرف بڑھائی۔ صلہ نے ایک اچھتی نگاہ ان پر اور ایک فائل پر ڈالی۔ قدرے بے دلی سے اس نے فائل تھام لی۔ ”یہ کس چیز کی فائل ہے۔“

”بھئی تمہارا پلان کامیاب ہو گیا۔ یہ کنٹریکٹ ہے۔ میری فلم میں میرے ساتھ تم بھی ہدایت کاری کرو گی۔“ وہ مسکراتی بشارت سے بولیں۔ ”تو اس کے لیے کنٹریکٹ کی کیا ضرورت ہے۔ وہ تو میں ویسے بھی آپ سے پوچھتے بغیر مداخلت کروں گی۔“ وہ فائل رکھتے آہستگی سے بولی تھی۔

”تم سمجھ نہیں رہی ہو۔ پروڈیوسرز نے مجھے یہ سہولت دی ہے کہ میں کسی کو معاون ہدایت کار کے طور پر پائمنٹ کر سکتی ہوں۔ میں نے تمہارا نام دے دیا اور اب یہ کانٹریکٹ بن کر آ گیا ہے سو میں نے تمہیں بلوایا ہے۔ تین مہینے تک ہمیں کام شروع کرنا ہے۔“ وہ پھر سے چیزیں سمیٹ کر ڈرار میں رکھ رہی تھیں اور کچھ اپنے بیگ میں ان کی گھر جانے کی تیاری تقریباً مکمل تھی۔

”کس سوچ میں گم ہو بھئی۔“ انہوں نے خاموش بیٹھی صلہ کے آگے چٹکی بجائی وہ چونکی۔ ”سوچ رہی ہوں میرا منصوبہ اتنی جلدی کیسے کامیاب ہو گیا۔“ اس کے سپاٹ انداز پر زرینہ ٹھٹھکیں۔ مگر اگلے ہی لمحے مسکرا دیں۔

”اچھا زیادہ سوچومت۔ اور اس پر سائن کر کے مجھے دے دو۔ یا پھر اگر تم پڑھنا چاہو یا پروجیکٹ کے متعلق کوئی سوال ہو تو پوچھ لینا۔“ وہ رساں سے گویا ہوئیں۔ صلہ کے سامنے فائل جوں کی توں رکھی تھی۔ اس نے کھول کر بھی نہیں دیکھی تھی۔ ”کیوں اپنی فلم کا بیڑہ غرق کروانا چاہتی ہیں آپ۔ اس سے تو اچھا ہے اعقان باری کو پائمنٹ کر لیں۔ اس کے پاس اکیلے کام کرنے کا تجربہ بھی ہے اور کانفیڈنس بھی۔“ آپ خواہ مخواہ مروت میں نہ پڑیں۔“

”مروت؟“ انہوں نے ہنستے ہوئے دہرایا۔ ”ایک تھپڑے پڑے گا سیدھی ہو جاؤ گی۔ کام کے معاملے میں کیسی مروت۔ مجھے تمہاری قابلیت اور وژن چاہیے تجربہ کتنا ہے اس سے مجھے فرق نہیں پڑتا۔ تم نے جس طرح اس فیس بک کی ویڈیو میں میری اچھی سے اچھی پرفارمنس کے ساتھ میری خراب ترین پرفارمنس کو استعمال کیا ہے وہ قابل تحسین ہے۔“

”زرینہ وہ تو پوسٹ پروڈکشن میں ایڈیٹر بھی کر سکتے ہیں۔ مجھے اب کسی بھی ڈائریکٹر کے ساتھ کام نہیں کرن۔ اسودہ جب تک پورا نہیں ہوگا میرا میں تب تک کچھ نہیں کروں گی اور لکھنے کا موڈ بننے یا بنانے تک میں اکثر فارغ ہی ہوتی ہوں۔ یہ پیسہ شہرت جہاں آ جائے وہاں دوستی خراب ہونا لازمی امر ہے۔ آپ کے اسٹنٹ تک تو ٹھیک ہے مگر آپ کی ہم رتبہ سیٹ سنبھالنا میرے بس کی بات نہیں ہے۔“ وہ سنجیدگی سے گویا ہوئی زرینہ سرشاری ہو گئیں۔ بے شک ان کا انتخاب غلط نہیں تھا۔

”اب تو یہ پروجیکٹ تم ہی کرو گی۔ پکڑو یہ فائل اور اب ایک لفظ بھی میں نہیں سنوں گی۔ بہت بحث کرتی ہوں۔“ انہوں نے قطیعت سے

گویا بات ختم کی۔ صلہ قدرے بے بسی سے انہیں دیکھ کر رہ گئی۔

”ہائے اللہ! تم فلم بناؤ گی اور وہ بھی زرینہ احمد خان کے ساتھ۔“ ہما کی بے یقینی چمک ابھری۔ اعغان باری کے چلتے قدم یکدم رکے تھے۔ کمرے کا دروازہ بند تھا مگر آوازیں واضح آرہی تھیں۔

”کیا مطلب؟“ ندیا کی حیران آواز آئی۔

”بھئی یہ زرینہ کی کوڈائزیکٹر کے طور پر فلم میں کام کرے گی۔ ان کی برابر کی سیٹ پر۔ مانی گاڈ۔ گھر میں سب کتنے خوش ہوں گے۔ ویسے بڑی چھپی رستم نگلی یہ خواہ مخواہ میں اسے کنویں کا مینڈک کہہ رہی تھی۔“ ہما پر جوش تھی۔ اعغان دہلیز پر کھڑا سن رہ گیا۔ ندیا کی بھی ایکساٹمنٹ سے چیخ ابھری تھی۔ ”یہ دیکھو Contract کی فائل۔ مانی گاڈ آفر بھی کتنی زبردستی ہے۔“ وہ فائل کھولے کھڑی تھی۔ جبکہ صلہ خاموش تبسم سی ان دونوں کو دیکھ رہی تھی۔ دہلیز پر کھڑے اعغان باری کی کشادہ پیشانی پر شکنوں کا جال بچھا تھا۔ نظروں میں بے انتہا ناگواری درآئی۔ مٹھیاں بھینچتا وہ سٹوڈیو کی جانب چل دیا۔



پروجیکٹ کی کامیابی کی خوشی میں دعوت کا اہتمام کیا گیا تھا۔ پورا ہال فلیش لائٹس اور سجاوٹ کی چیروں سے جگر جگر کر رہا تھا۔ تمام ٹیم نے مل کر ہال کو غباروں وغیرہ سے سجا یا تھا۔ ہال کے ایک جانب زرینہ کے دوست احباب اور دیگر سینئر آرٹسٹ صوفوں پر براجمان جوسز اور ادبی گفتگو سے شغف فرما رہے تھے۔ تو دوسری جانب قدرے ہلکی لائٹس میں نوجوان پارٹی نے کلب کا سا سماں کر رکھا تھا۔ قریب ہی طارق اپنا لیپ ٹاپ شیر یو سے انچ کے مختلف نمبرز پلے کر رہا تھا۔ زیادہ تر انگلش نمبرز پر چند منچلے نوجوان عجیب و غریب سارقص کرنے لگتے اور باقی سب نوجوان صوفوں پر بیٹھے تالیاں پیٹتے ہنستے لطف اندوز ہوتے۔ قریب ہی کونے میں بڑی سی میز پر اشیائے خورد و نوش اور جوسز کے ڈھیر لگے تھے تاکہ سب اپنی مرضی کا کھانا لے کر دوسری جانب لگی کرسیوں پر بیٹھ کر کھا سکیں۔ وہیں پاس پڑی کرسی گھسیٹ کر صلہ بیٹھ گئی۔ اور اپنے لیے اورنج جوس انڈیلنے لگی۔ سب پر تکلف سا ڈنر کر کے آرام سے بیٹھے تھے۔ وہ ارد گرد سے بے نیاز جوس کی سطح پر بنتے بلبلیے بلا ارادہ دیکھے جا رہی تھی۔ بے ہنگم سے موسیقی کے بعد یکدم خاموشی ہوئی۔ صلہ نے گہری سانس لیتے ارد گرد نظر دوڑائی۔ اگلا نغمہ شروع ہوتے ہی اس کے لبوں پر بے اختیار تبسم بکھر گیا۔ تمام سینئر ز بھی طارق کی جانب گلاس اونچا کیے اس کے ذوق کی داد دے رہے تھے۔ وہ ہلکا سا سر تسلیم خم کر کے داد وصول کر رہا تھا۔ ”ہماری سانسوں میں آج تک وہ۔“

”حنا کی خوشبو مہک رہی ہے۔“ نور جہاں کی پرترنم آواز سے ہال گونج اٹھا تھا۔ وہ زیر لب مسکرائی۔ یہ نغمہ اسے بے حد پسند تھا۔ اس کی میلوڈی سنتے بے اختیار دل جھوم اٹھتا تھا۔ جیسے ساری کائنات محور قضاں ہو۔

نوجوان پارٹی کی جانب سے اچا نو شور و غوغا بلند ہوا تھا۔ زارا نے ایک الگ تھلک کونے میں بیٹھے بالاج کو کھینچ کر اٹھایا تھا۔ تھوڑی پس و پیش کے بعد سبکے شور مچانے پر وہ ناچار کھڑا ہو گیا۔ وہ دونوں صوفوں کے درمیان کسی منجھے ہوئے رقاصوں کی طرح خوبصورت کپل ڈانس کر رہے تھے۔ وہ میلوڈی کی تھاپ پر کبھی تیز اور کبھی مدھم ٹیپ کرتے ایک ساتھ بہت اچھے لگ رہے تھے۔ ان کا پور پور دھن سنگ ہم آہنگ محسوس ہو رہا تھا۔

زارا کا تھمتا چہرہ اس کے اور مغینہ کے جذبات کا عکاس تھا۔ جبکہ بالاج قدرے سپاٹ چہرہ لیے ساتھ بھارہا تھا۔ اس کے باوجود قص پر اس کی چابکدستی حیرت انگیز تھی۔

ہماندیا کے ساتھ بیٹھی تالیاں بجاتی خوب لطف اندوز ہوتی معلوم ہو رہی تھی۔ صلہ بے اختیار رخ موڑ گئی۔ مگر اگلے لمحے جیسے سب منجمد ہو گیا۔ بالاج دونوں ہاتھ اوپر اٹھاتا معذرت کرتا بیٹھ گیا۔ ہال زوردار تالیوں سے گونج اٹھا۔ مگر صلہ کی محویت ہنوز قائم تھی۔ وہ ساکت سامنے سینئرز سے ملتے جمال یوسف کو یک ٹک دیکھ رہی تھی۔ بلیک ڈزسوٹ میں وہ ہمیشہ کی طرح شاندار لگ رہے تھے۔ بالاج کی نظر بے ساختہ بت بنی صلہ پر پڑی تھی۔ وہ بے اختیار ٹھٹھکا تھا۔ اس کے چہرے پر عجیب سا تاثر تھا۔

”تڑپ میرے بے قرار دل کی کبھی تو ان پر اثر کرے گی۔“

کبھی تو وہ بھی جلیں گے اس میں جو آگ دل میں دھک رہی ہے۔“ نور جہاں لہک لہک کر آخری شعر دہرا رہی تھیں۔

دل میں ہک سی اٹھی تھی۔ آنکھوں کے گوشے نم ہو گئے تھے۔ اپنے دوستوں سے خوش گپیوں میں مصروف اس شخص سے اس نے بے پناہ محبت کی تھی۔ اور وہ محبت کوئی فلسفیانہ محبت نہیں تھی۔ جمال یوسف کے تجاہل عارفانہ سے کام لینا اسے بے حد کھلتا تھا۔ زرینہ قریب ہی ان کے ساتھ کھڑی کسی بات پر مسکرا رہی تھیں۔ متلاشی نظروں سے ارد گرد دیکھتی وہ شخصیں پر مسکراتی جمال کو ساتھ لیے اس کی جانب بڑھیں۔ اپنی طرف آتا دیکھ صلہ بے اختیار کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

”کب سدھرو گی تم لڑکی.....“ انہیں پاس آتے ہی اسے شفقت سے ڈپٹا۔ ”کبھی کبھی تو مجھے شک ہوتا ہے کہ تم واقعی 23 سال کی ہو۔“ ان کے تبصرے پر صلہ ہلکے سے مسکرا دی۔

”یہ میڈم سمجھتی ہیں کہ بڑے آرٹسٹ لوگ محفل میں اکیلے بیٹھتے ہیں۔ بس انہی کی تھلید میں لگی ہے۔“ جمال شگفتگی سے مغل ہوئے۔

”ہاں تو ہے بڑی آرٹسٹ..... اس میں کیا شک ہے۔“ زرینہ نے ہولے سے اس کی تھوڑی کو چھوا۔ وہ گہری نظروں سے اس پکچر پر فیکٹ کو دیکھ کر رہی تھی۔ سیاہ وچ کلر کے امتزاج کے لباس میں زرینہ کا سرخ و سفید چہرہ تھکا تھکا سا لگ رہا تھا۔ وہ دونوں ساتھ میں بہت اچھے کس قدر مکمل لگتے تھے۔ وہ سینے پر بازو لپیٹے گہرا سانس لیتی سر جھکا گئی۔ وہ دونوں کسی بحث میں مصروف تھے۔ زرینہ سے لاکھ دوستی سہتی مگر رقابت آج بھی ویسے ہی قائم تھی۔ زرینہ ایکسکیو ز کرتی وہاں سے چل دی۔ انہیں کسی کوریسیو کرنا تھا۔ جمال یوسف کی خاموش نگاہوں نے ان کے اوجھل ہو جانے تک تعاقب کیا تھا۔ پھر وہ گھوم کر صلہ کی جانب متوجہ ہوئے۔ ہنک کے گہرے احساس سے اس کا چہرہ سرخ پڑ گیا تھا۔

”بھی آج تو صلہ رحمان خاصی معقول لگ رہی ہیں۔“ انہوں نے اس کے سچے سنورے وجود پر تبصرہ کیا۔

”یہ تو ہما اور زرینہ کی محنت ہے۔ میرا اس سے میں کوئی کمال نہیں۔“ وہ دل گرفتگی سے بولی تو جمال اس دکش سراپے کی مالک سمارٹ سی لڑکی کو دیکھ کر رہ گئے۔ اس کی رف اور لف روٹین کے باعث وہ اپنا بالکل خیال نہیں رکھتی تھی۔ ورنہ کم تو وہ کسی سے بھی نہیں تھی۔

”اچھا یہ دیکھو میں تمہارے لیے کیا لایا ہوں۔ انہوں نے ریپ کی ہوئی ایک چھوٹی سی کتاب کوٹ کے اندرونی جیب سے نکال کر اسے تھمائی۔“

”یہ کس خوشی میں؟“ اس نے متحیر سے انداز میں پوچھا۔

”بھی تمہاری فلم سائن کرنے کی خوشی میں۔“ وہ کھل کر مسکرائے۔ ”تصویراتی کرداروں میں حقیقت کا رنگ بھرنے کی جانب پہلا قدم تمہیں بہت مبارک ہو۔“ وہ دلی خلوص سے بولے تھے۔

”تھینک یو“ وہ سارے میں پہلی دفعہ کھل کر مسکرائی تھی۔

ان سے قدرے فاصلے پر گہری نگاہوں سے انہیں دیکھتا بالاج علی شاہ یکدم صوفے سے اٹھا تھا۔ اور لمبے ڈگ بھرتا باہر نکل گیا۔

☆.....

”فلم کی ستوری تو اچھی ہے۔ وہ کیوں نہیں چلے گی؟“ اعفان کے تبصرے پر لڑکی نے پوچھا تھا۔ وہ دونوں ٹیرس پراسکیلے بیٹھے تھے۔ جب اعفان نے مطلب کی بات کی۔

”فلم بنے ہی نہیں تو چلے گی کیسے۔“ اعفان نے کہا۔

”کیا مطلب؟“ لڑکی نے اچنبھے سے دچھا۔

”تمہاری دوست ہے نا صلد رحمان۔ وہ یہ فلم بننے ہی نہیں دے گی۔“ اعفان نے مسکراتے کہا۔

”وہ کیوں ایسا چاہے گی۔“ لڑکی نے زچ آکر پوچھا تھا۔

”اچھا پھر یہ سنو۔“ یہ کہتے اعفان نے سیل پر ریکارڈنگ آن کی۔ وہ صلد اور جمال یوسف کی آوازیں تھیں۔ لڑکی جو سپاٹ سے انداز میں بیٹھی تھیں یکدم چونکی۔

”اب بولو۔“ ریکارڈ شدہ آواز بند ہوتے وہ فاتحانہ انداز میں بولا تھا۔ لڑکی کچھ بول ہی نہ پائی بس حیرانگی سیل فون کو نکلی۔

”وہ اور جمال یوسف سیٹ پر باتیں کر رہے تھے جب میں مسعود کے پاس اپنی ایک DV چیک کرنے کے لیے لے گیا تھا۔ وہ دونوں کیمرا کے قریب ہی تھے، مسعود ریکارڈنگ چلا کر چلا گیا۔ میں یونہی اسے چیک کرنے لگ اجب مجھے صلد کی خاصی جذباتیت بھری باتیں سنائی دیں۔ میں نے خواہ مخواہ ریکارڈنگ بند نہیں کی۔ اور ان کی ساری آوازیں اس DV میں ریکارڈ ہو گئیں۔“ وہ چپ ہوا تو لڑکی بے یقینی سے اسے دیکھے گی۔

”اس ریکارڈنگ سے تو یہ ثابت نہیں ہوتا کہ وہ فلم خراب کرا کر بدلہ لینا چاہتی تھی۔ ہاں ترقی کا زینہ اس نے ان کی فلم کو بنایا ہے۔ اور بڑے سوچے سمجھے انداز میں اپنا کام انہیں دکھانے میں اس نے بے ساختگی سے کام لیا ہے ورنہ زینہ اتنی جلدی متاثر ہونے والوں میں سے نہیں ہیں۔“ وہ لڑکی سوچ سوچ کر بول رہی تھی۔ اعفان نے نفی میں سر ہلایا۔

”تم سمجھی نہیں۔ رقابت بڑی بڑی شے ہے۔ پل میں محبوب کی محبوب ترین ہستی سے محبت سی ہونے لگتی ہے اور اگلے پل شدید نفرت۔ وہ بہت عرصے سے جمال یوسف میں انٹرنل ہو گئی۔ اس کی باتوں سے اس کے جذبے کی شدت کا پتہ چلتا ہے۔ ضرور لڑکھن میں اسے ان سے محبت ہوئی ہوگی۔ محض ان کو ستانے کے لیے وہ زینہ کا سب سے بڑا خواب چکنا چور کرنا چاہتی ہے۔ محبت میں بے بسی اس جیسی شدت پسند لڑکی اسے ایسے امتحان قدم اٹھوا سکتی ہے۔“ وہ چند لمحے خاموش رہ کر اس لڑکی کا رد عمل دیکھنے کو رکا۔ وہ بے تاثر چہرہ لیے بیٹھی تھی۔ ”کیا ہوا۔“ اسے الجھا ہوا سادہ کچھ اس نے پوچھا تھا۔

”پرسوں میں نے اس کی ڈائری اتفاقاً دیکھی تھی ریٹ ہاؤس کی الماری میں۔ کافی پرانی ڈائری لگتی تھی۔ شاید اس کے مسودے کا کچھ ابتدائی حصہ اس میں تھا۔ اسی لیے وہ ساتھ لے آئی تھی۔ اس میں.....“ وہ قدرے ہچکچائی۔ اعنان آگے کو جھکا۔ اس میں کیا؟“ وہ جیسے کسی ٹرانس کی سی کیفیت میں تھی۔ ”زرینہ کے لیے بے پناہ نفرت کا اظہار کیا گیا تھا۔ میں نے سوچا شاید جذباتیت میں لکھا ہے۔ مگر اب لگتا ہے جیسے سب سوچ سمجھ کر اس نے..... اف“ وہ سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔ ”وہ ایسی تو نہیں تھی۔ وہ ہرگز ایسی نہیں تھی۔“ وہ صلہ کو جتنا جانتی تھی وہ واقعی اسے ایسا نہیں سمجھتی تھی۔

”محبت انسان سے کچھ بھی کروا سکتی ہے۔“ وہ گرل پکڑے باہر دیکھ رہا تھا۔ پھر یکدم مڑا۔

”تم مجھے وہ ڈائری لا کر دے سکتی ہو۔“

”کیوں؟“ وہ لڑکی محتاط ہوئی۔

”دیکھو زرینہ کے علاوہ اور بہت سے لوگ اس پروجیکٹ سے جڑے ہیں۔ انہیں بتانا ضروری ہے۔ وہ شاید آواز پر یقین نہ کریں جتنا اس کے لکھے پر کریں گے۔“ اعنان نے کہا تھا۔

”نہیں میں امانت میں خیانت نہیں کر سکتی اور یہ کوئی اتنا بڑا مسئلہ نہیں ہے جسکے باعث میں اس کا بھر سہ توڑوں۔ اور ویسے بھی مجھے اب بھی یقین ہے وہ اس نیت سے یہ سب نہیں کر رہی تھی۔“ وہ ٹھوس لہجے میں بولی تھی۔ اعنان نے قدرے تاسف سے اسے دیکھا تھا۔

”مرضی ہے تمہاری۔“ لا پرواہی سے کندھے اچکا تے وہ باہر دیکھنے لگا۔ پھر کچھ سوچ کر وہ اس کے قریب کرسی ڈال کر بیٹھ گیا۔

”میں یہ سب زرینہ کے لیے یا انسانی ہمدردی میں نہیں کر رہا ہوں اور نہ ہی مجھے ہمدردی وغیرہ کا کوئی شوق ہے۔ یہ میں ہمارے لیے کر رہا ہوں۔ تمہارے گھر ایک فلم سٹار کا رشتہ جائے گا تو ڈبل اتر پڑے گا۔ میں کوئی اچھا آدمی نہیں ہوں مگر تم سے شادی کر کے میں نئی زندگی شروع کرنا چاہتا ہوں جہاں ماضی کا کوئی سایہ نہیں ہوگا۔“ وہ رکا..... وہ لڑکی ابھی کسی گہری سوچ میں گم بیٹھی تھی۔ ”رہا سوال زرینہ اور صلہ کی دوستی کا تو میرا نہیں خیال کہ یہ کوئی اتنا بڑا ایٹو ہے۔ یہ صرف ابتدائی شاک ہوگا۔ جس سے یکدم رد عمل سامنے آئے گا۔ وہ دونوں خاصی انتہا پسند ہیں۔ منٹوں میں فیصلے کرنے والی۔ شاک دینے کے لیے یہ وقت پرفیکٹ ہے۔ صلہ کا پتہ صاف ہوتے ہی میرا نمبر آگے گا۔ کیونکہ پروڈیوسر زیرے جاننے والے ہیں۔ ان کی فیس چوائس میں ہی تھا۔ صلہ صرف زرینہ سے دوستی کے باعث درمیان میں آگئی اور اگر میرا نمبر ہدایتکاری کے نہ بھی آیا تو کوئی اہم کردار مجھے آفر ہو ہی جائے گا۔ جو کہ صلہ کے ہوتے ہوئے امپابل ہے۔“ لڑکی نے پر سوچ نظروں سے اسے دیکھا تھا۔ اعنان اپنی تقریر کا اثر دیکھتے پھر سے گویا ہوا۔ ”چند دنوں تک زرینہ کا غصہ ٹھنڈا ہو جائے گا کیونکہ وہ کوئی ٹین رتج لڑکی تو ہیں نہیں جو صلہ کی بے وفائی نہ بھول سکیں۔ وہ سمجھ ہی جائیں گی کہ یہ سب صلہ نے وقتی جذباتیت کے باعث کیا تھا۔“ وہ ریلیکس سا کرسی پر ٹک گیا۔ اس کے چہرے پر آسودہ مسکراہٹ تھی۔ لڑکی متذہب سی تھی۔ مگر یہ وقتی گلٹ تھا۔ حقیقت پسندی سے سوچنے پر اسے احساس ہو جائے گا کہ یہ کوئی اتنی بڑی بات تو نہیں ہے۔ مگر وہ لڑکی کچھ اور ہی سوچ رہی تھی۔

.....☆.....

دودن میں انہیں ریست ہاؤس خالی کرنا تھا۔ چھوٹے موٹے کام نمٹا کر ساری ٹیم رخصت ہونے کو تیار تھی۔ اس پروجیکٹ سے سب کی خوبصورت یادیں جزی تھیں۔ سب اپنے کام سے بے حد خوش اور مطمئن تھے اور آج کل سوشل میڈیا اور ناقدین کے ذریعے لوگوں کی تعریفیں اور تبصرے و تجزیے دیکھ دیکھ کر محفوظ ہو رہے تھے۔

صلہ ٹیم کا حصہ نہ ہوتے ہوئے بھی اپنی زندگی خوبصورت ترین تجربے سے گزار رہی تھی۔ فلم کے بارے میں ابھی اس نے گھر نہیں بتایا تھا۔ وہ دودن بعد لاہور جا کر سب کو سر پر اندر دینا چاہتی تھی اور دوسری بڑی خوشی اس سب سے بالاتر تھی۔ اس کا مسودہ مکمل ہو چکا تھا۔ اس نے مسکراتے ٹیبل پر پڑی اپنی فائل کھولی۔ سرورق پر خوبصورت ہینڈ رائٹنگ میں ”عنایا“ لکھا تھا۔ عنایا جہانگیر اس کی تخلیقات میں سب سے اچھوتا اور بے حد دلچسپ کردار تھا۔ زرینہ احمد خان کی شخصیت اور عنایا جہانگیر میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ اس کے باوجود ڈیڑھ سال پہلے جب اس نے رف سا کچھ جمال یوسف کو دکھایا تو انہوں نے بے ساختہ زرینہ کا نام تجسٹ کیا تھا اور اس نے فوراً سے بیشتر نفی میں سر ہلایا تھا۔ اس کے مطابق یہ زرینہ کے بس کا نہیں تھا۔ مگر وہ جب سے زرینہ کے ساتھ تھی اسے ان کی شکل میں جیتی جاگتی عنایا جہانگیر نظر آنے لگی تھی۔ ان کے پاس اداکاری کی خدا داد صلاحیت تھی۔ اس کے باوجود انہوں نے کبھی منفی کردار کسی بھی پلے میں ادا نہیں کیا تھا۔ مگر ان کے ساتھ کام کرنے کے دوران اس نے ان میں عنایا جہانگیر کی ہلکی سی جھلک دیکھ لی تھی۔

کمر اس وقت خالی تھا۔ اس کا زیادہ تر سامان تاپا جان کے گھر تھا۔ وہ چند دن یہاں رہی تھی۔ لہذا یہاں کی الماری سے وہ اپنا سامان لینے آج ریست ہاؤس آئی تھی۔ اس نے آخری بار الماری کھول کر جائزہ لیا۔ ہما اور ندیا کا سامان ہنوز پڑا تھا۔ تبھی اسے اپنی ڈائری کا خیال آیا۔ اس نے سامان کا جائزہ لینا شروع کیا۔ مگر اس کی ڈائری وہاں کہیں نہیں تھی۔ وہ سوچنے کوڑکی ”شاید تاپا گھر ہو“ وہ ابھی سوچ رہی تھی کہ موبائل کی میسج پیپ بج اٹھی۔ اس نے فون اٹھایا تو زرینہ کا میسج جگمگائی رہا تھا۔ وہ کھل کر مسکرائی۔ انہوں نے اسے گھر بلایا تھا وہ بھی ابھی۔ وہ سرشار سہی ہو گئی۔ پچھلے دنوں اس نے زرینہ کو اپنے مسودے کے متعلق آگاہ کیا تھا۔ اور عنایا جہانگیر کے کردار کو وضاحت سے سنایا تھا۔ وہ بہت پروفیشنل تھیں اور اداکاری کو عرصے سے خیر باد کہہ چکی تھیں۔ انہوں نے چند دن سوچنے کا وقت مانگا تھا۔ کیونکہ انہوں نے خود ابھی تک اس قسم کا کردار کبھی نہیں نبھایا تھا۔ اور آج وہ اسے گھر بلارہی تھیں۔ وہ بے حد ایکسائٹڈ تھی۔ جلدی جلدی تیار ہو کر باہر نکلی تو آسمان بادلوں سے بھرا تھا۔ اب بارش ہوئی کہ کب۔ اس نے رکشہ کروایا اور آدھے گھنٹے بعد وہ زرینہ کے چھوٹے مگر خوبصورت سے گھر کے سامنے گیٹ پر کھڑی تھی۔ Cats & Dogs کہلانے والا گھر پانچ کتوں اور تین بلیوں پر مشتمل تھا۔ زرینہ اور جمیل انہی کے درمیان کہیں فٹ بیٹھے تھے۔ اور ان کی فیملی مکمل تھی۔ ان کے گھر اکثر بھٹکے ہوئے جانوروں کا بھی بسیرا ہوتا تھا۔ جو چند دن زرینہ کے گھر کے مہمان ہوتے اور زرینہ ان کے لیے کوئی گارڈین تلاشتیں۔ ان کا بس چلے تو ساری دنیا کے جانور اپنے گھر لا کر پال لیں۔ وہ ایک مسکرائی نظر گھر پر ڈالتی اندرونی دروازے کی جانب بڑھی۔ گھر میں عجیب سی خاموشی تھی۔ ان کے Pets شاید کسی کمرے میں اودھم مچا رہے تھے۔ ورنہ لاؤنج ہمیشہ ان کی آوازوں سے گونجتا تھا۔ وہ زرینہ کے کمرے کی جانب بڑھی۔ مگر اندر سے آتی آوازوں نے اس کے قدم زنجیر کر دیے تھے۔ وہ وہیں رک سی گئی۔ وہ سانس روکے سن رہی تھی۔ اس دن جمال سے ہوئی ملاقات بے اختیار نظروں میں گھوم گئی۔

وہ ابھی بھی ویسے ہی تھے اسم یا مسمی جمال یوسف۔ وہ انہیں یوسف ثانی کہتی تھی۔ تین سال پہلے وہ ان سے اصلاح کروانے کی غرض سے جایا کرتی تھی۔ نسیم بادی کے باعث ملنے والے لوگوں میں وہ بھی شامل تھے۔ وہ سفر نامے لکھا کرتے تھے۔

”ارے صلہ۔ تم یہاں؟“ انہیں خوشگوار حیرت ہوئی۔ وہ بہت اچھے ٹینس پلیئر تھے ساٹھ سال کی عمر میں بھی 45 سے اوپر نہیں لگتے تھے۔ فٹنس انکا جنون تھا۔

”گیس کریں.....“ چبکی۔ وہ سوچ میں پڑ گئے۔ پھر صلہ سے کافی فاصلے پر اس کے عقب میں کھڑی زرینہ پر نظر پڑی تو چونک سے گئے۔ ”مائی گڈ نیس..... یعنی اپنا کہا پورا کر دکھایا تم نے ہاں.....“ وہ شگفتگی سے بولے۔ ”خیر ان سے ملو یہ رفعت ہمدانی ہیں۔ رفعت یہ میری بہت پیاری سی منھی سی دوست ہیں صلہ رحما۔ بہت اچھا لکھتی ہیں اور آج کل یہ یہ جس پر کام کر رہی ہیں بہت منفرد آئیڈیا ہے۔“ انہوں نے اپنے ساتھ کھڑی ادھیڑ عمر میک اپ کی دکان بنی خاتون سے متعارف کروایا۔ ایکسا ٹمٹ میں وہ انہیں دیکھ ہی نہیں پائی۔ سو جھٹ سے سلام کیا جسکا انہوں نے قدرے نخوت سے جواب دیا تھا۔

”ریٹلی.....“ وہ جمال یوسف کی تعریف پر حیران ہوئیں۔ ”خیر آپ تعریف کر رہے ہیں تو ضرور اچھی ہوگی۔ آپ سے اچھا ذوق تو کسی کا نہیں ہے۔“ وہ اک ادا سے بولیں۔ صلہ کلس کر رہ گئی۔

”جی ایسا کچھ نہیں ہے۔ یہ تو بس ان کی سٹوڈنٹ ہونے کی وجہ سے ذرا نرم گوشہ رکھتے ہیں۔“ اس نے متنبہ نگاہوں سے جمال یوسف کو دیکھا۔ وہ تردید کرتے رک گئے۔

”آپ ٹورنٹو سے کب آئے؟“ وہ دبے دبے جوش سے بولی۔ جی تو چاہا کھڑے کھڑے ان کے گزرے ماہ و سال کا حساب لے۔ ”بس کچھ ہی دن ہوئے آئے ہوئے کراچی چکر لگا۔ تو رفعت سے ملاقات ہوگئی سو سوچا باقی دوستوں سے بھی ملاقات ہو جائے گی۔“ وہ صلہ کے عقب میں خاصے فاصلے پر کھڑی کسی سے باتیں کرنے میں مصروف زرینہ کو دیکھتے بولے۔ ان کی اداس نظروں میں ہزار رنگ در آئے۔ وہ پڑ مردگی سے سر جھکا گئی۔ خواہ مخواہ سوال کیا۔ بہانے سے ہی سہی ان کی ایک جھلک دیکھنے آئے تھے۔ رفعت ہمدانی شناسا پر نظر پڑتے ایکسکیو ز کرتے چل دیں کہ جمال ابھی اس منھی دوست سے باتیں کرنا چاہتے تھے۔ وہ پرائیویٹ چینل کی ہیڈ تھیں۔ یہ پروجیکٹ انہی کے چینل کے لیے بنایا جا رہا تھا۔

”تم بتاؤ کیسی ہو؟ اور یہاں کیسے پہنچیں..... کہیں اس Page کی وجہ سے تو نہیں؟“ وہ مشفق سے انداز میں پوچھ رہے تھے۔

”جی نہیں۔ اتفاقاً ملاقات ہوئی تھی ان سے۔ اپنی معصوم شکل کس دن کام میں لانی تھی۔“ وہ نارمل سے انداز میں بولی پہلے سا جوش منقود تھا۔

”ہا mean صلہ۔ زرینہ کو پتہ چلا کہ تم نے رقابت میں ان سے دوستی کی ہے تو کبھی معاف نہیں کریں گی تمہیں۔ دوستی اور محبت کے معاملے میں وہ تمہارے جیسی ہی شدت پسند ہیں۔“ ان کی کشادہ پیشانی پر بل پڑ گئے۔ صلہ نے شکایت آمیز نظروں سے انہیں دیکھا۔ تو وہ گہری سانس لے کر رہ گئے۔ اتنا عرصہ گزر جانے کے بعد بھی اس کی محبت ویسی ہی تھی۔ رات کی رانی جیسی..... دکھائی نہیں دیتی مگر خوشبو ہر طرف پھیلی ہوتی ہے۔

”تم جانتی ہو میں کتنا حسن پرست ہوں۔ ایک جگہ ٹھہر نہیں سکتا۔ دنیا کا چپہ چپہ چھاننا چاہتا ہوں۔“ ان کے لہجے میں بظاہر شرارت مگر

در پردہ تنبیہ تھی۔ وہ اس کے جذبات کو یونہی ہنسی میں اڑا دیا کرتے تھے۔

”اب اتنی بھی گئی گزری نہیں ہوں میں کہ ان خاتون سے میرا موازنہ کریں۔ بوڑھی گوڑھی لال لگام۔“ وہ منہ بناتے بولی۔ ان کے چہرے کے نقوش یکدم تن گئے۔ ”زرینہ کی بات کر رہی ہو؟“ ان کے لہجے میں سخت برہمی تھی۔

”میں رفعت میڈم کی بات کر رہی ہوں۔“ وہ جل کر بولی تو وہ قہقہہ لگا کر ہنس دے۔

”وہ صرف دوست ہے۔“ ابھی۔ اتفاقاً ملی تھیں میں نے سوچا باقی دوستوں سے ملاقات رہے گی۔

”جیسے میں جانتی نہیں آپ کو..... زرینہ کو وہی دیکھنے آئے ہیں آپ اور یہ بھی جانتی ہوں کہ ان سے ملے بغیر ہی چلے جائیں گے۔“ وہ ٹھوس

لہجے میں بولی تھی۔ ”جب سب جانتی ہو تو سدھر کیوں نہیں جاتی۔“ وہ نرمی سے بولے۔ ”میں دیکھنا چاہتی تھی کہ ان میں ایسا کیا ہے جو برسوں سے اتنی

کاروگ لگائے بیٹھے ہیں۔“ وہ نرموٹھے پن سے بولی۔

”تو اب دیکھ لیا ہے نا۔ وہ رُکے۔ اب سب ختم کرو اور واپس چلو۔ تمہیں کوئی حق نہیں دوستی کے نام پر انہیں سیڑھی کی طرح استعمال کرنے

کا۔ تمہارے خواب تمہاری قابلیت کے بل بوتے پر بھی پورے ہو سکتے ہیں۔“ وہ دبی دبی آواز میں قدرے سختی سے بولے تھے۔ وہ ساکت رہ گئی۔

یکلخت ڈھیروں دھندلگا ہوں میں در آئی تھی۔

”ان کی بہت فکر ہے آپ کو۔“ اس کے انداز میں بلا کا دکھ تھا۔ ”اور میں جو ڈھائی سال سے اتنی محنت کرنے کے باوجود وہی کھڑی ہوں

جہاں پہلے دن تھی۔ وہ نظر نہیں آتا آپ کو؟ وہ لب کاٹتی آنسو پینے کی ناکام کوشش کرنے لگی۔ جمال لب بھیچے بے بسی سے اسے دیکھے گئے۔ ”صلہ“

ارد گرد نظر دوڑاتے وہ اسے کاندھوں سے تھامے اپنے ساتھ لگائے سٹوڈیو سے باہر لے آئے۔ یہاں بہت سے لوگ انہیں جانتے تھے۔ زرینہ اور وہ

ساتھ کام کر چکے تھے۔ شائقین کو ان کی جوڑی از حد پسند تھی۔ وہ تپ شوقیہ ٹیلی وژن پر کام کرتے تھے جب انہیں زرینہ احمد خان سے پہلی نظر کی محبت

ہوئی تھی۔ مگر اس وقت جمیل اختر ان کی زندگی میں آئے چکے تھے اور وہ اپنے گھر والوں کو منانے کی سعی کر رہی تھیں اس وقت سے وہ اپنی محبت چھپائے

دنیا بھر کی خاک چھانٹے پھر رہے تھے۔ صلہ کو ان کا پدرانہ شفقت سے بھرپور لمس اپنے جذبات کی تذلیل محسوس ہوتا تھا۔ ان کا ہاتھ جھٹکتے وہ قریب

پڑی کرسی پر آ بیٹھی۔ وہ متاسف سے سر جھٹکتے دوسری کرسی گھسیٹ کر اس کے سامنے بیٹھ گئے۔ باہر شام پر پھیلائی تھی۔ مغرب کے وقت کی ساری

یاسیت جیسے صلہ کے چہرے پر گڑھ گئی تھی۔

”میں مانتا ہوں کہ اس فیلڈ میں آگے بڑھنے کے لیے خود سے مواقع پیدا کرنے ہوتے ہیں۔ مگر زرینہ دوستی کے معاملے میں بہت جذباتی

ہیں۔ تمہاری اس حرکت کے بعد ان کا دوستی پر سے یقین اٹھ جائے گا۔ تم سمجھ کیوں نہیں رہی ہو۔“ ان کی سوئی ابھی بھی زرینہ پرانگی تھی۔ صلہ نے بڑی شاکی

نظروں سے دیکھا تھا۔ ”زرینہ کی جگہ کوئی اور ہوتی تو آپ کبھی ایسا نہ کہتے۔ بلکہ میری عقلمندی کی داد دیتے۔“ وہ تلخی سے بولی تھی۔ جمال نظریں چرا گئے۔

”دکھ تو مجھے اس بات کا ہے کہ آپ مجھے اتنا گھٹیا سمجھتے ہیں کہ میں آپ کے توسط سے حاصل ہوئی ان کی ذاتیات، پسندنا پسند کو استعمال کر

کے ترقی حاصل کرنا چاہتی ہوں۔“ وہ آنسو پونچھتی آہستگی سے بولی تھی۔ ان کے تنے اعصاب یکدم ڈھیلے پڑ گئے۔ ”اچھا..... لیکن تم انہیں سرے سے

ادا کار ہی نہیں مانتی تھیں۔ ان کی تو بس قسمت اچھی تھی جو دو اچھے کرداروں سے ہٹ ہو گئیں۔“ وہ آخر میں اس کی نقل اتارتے ہوئے تو وہ بے ساختہ مسکرا دی۔ جمال مبہوت سے اسے دیکھ کر رہ گئے۔ نم آنکھوں کے ساتھ جھینپ کر ہنستی وہ دل میں گڑسی گئی۔

”پہلے کبھی انہیں جمال یوسف کی نگاہ سے نہیں دیکھا تھا نہ اس لیے.....“ وہ بڑے مان سے بولی تھی۔ وہ بھی کھل کر مسکرا دیے۔

”تمہارے جیسے نمونے خدا روز بروز نہیں بناتا۔ اس لیے میں چاہتا ہوں کہ تم خوش رہو۔ تمہارا تخیل بہت زرخیز ہے اسے استعمال کرو۔ میں نہیں چاہتا کہ تم خود کو ان فضولیات میں ضائع کرو۔ اگر میری بیٹی ہوتی تو تمہاری عمر کی.....“

”پلیز سر.....“ صلہ نے سختی سے انہیں ٹوکا۔ ”میری محبت میرا ذاتی مسئلہ ہے۔ مگر اس بے دردی سے میرے جذبات کی توہین کرنے کی اجازت

میں آپ کو قطعاً نہیں دے سکتی۔“ وہ انتہائی برہم نظر آرہی تھی۔ پھر یکدم انھی اور واپس اندر سٹوڈیو میں چلی گئی۔ وہ بے چارگی سے اسے دیکھ کر رہ گئے۔

.....☆.....

اندر سے آتی آوازیں بند ہو گئی تھیں۔ مگر وہ بت بنی دروازے کو پتھرائی نظروں سے نکلتی ہنوز کھڑی تھی۔ سب ختم ہو گیا۔ بے اختیار اس کا سر دروازے کے ساتھ ٹک گیا۔ آنکھوں سے آنسو لڑیوں کی مانند لڑھک رہے تھے۔ وہ آواز رو رہی تھی۔ وہ چیخ چیخ کر بتاتی کہ اس نے یہ سب اس نیت سے نہیں کہا تھا تب بھی کوئی یقین نہیں کرے گا۔ کاش کے ریکارڈ کرنے والے نے سٹوڈیو سے باہر ان دونوں کی باتیں بھی ریکارڈ کی ہوتیں۔ اس کا جی چاہا وہ سب چھوڑ چھاڑ کر وہاں سے بھاگ جائے۔ زرینہ کا سامنا کرنے کی ہمت اس میں بالکل نہیں تھی۔

”اگر جمال خود آ کر بھی یہ کہیں میں تب بھی یقین نہیں کروں گی۔“ وہ مڑنے کو تھی جب زرینہ کے الفاظ اس کے کانوں میں گونجنے لگے۔

دل کو یکدم ڈھارس سی ہوئی۔ گہرا سانس لیتے آنکھیں پونچھتے وہ پھر دروازے پاس گئی۔ اندر گہری خاموشی چھائی تھی۔ جی کڑکراتے وہ دروازہ کا لٹو

گھماتے دھیرے سے دھکیل کر اندر بڑھی۔ کمرے میں ملجھکی سی روشنی تھی۔ زرینہ لبوں پر ہاتھ رکھے سامنے سیز یوسٹم پر نظریں جمائے بیٹھی تھیں ڈ۔

اسے بے اختیار وہ دن یاد آیا تھا جب انہوں نے اسی سٹم پر زرینہ کی فیورٹ البم سنی تھی اور آج..... وہ آہستگی سے آگے بڑھی۔ چلنے کی آہٹ پا کر

زرینہ نے چونک کر اسے دیکھا تھا۔ ان کی سرد نگاہیں اس پر جم سی گئی تھیں۔ اس نے فوراً سر جھکا لیا۔ اس کا دل کسی اتھاہ گہرائی میں ڈوب کر ابھرا تھا۔

چند لمحوں کی خاموشی صدیوں پر محیط محسوس ہو رہی تھی۔ وہ یکنخت صوفے سے اٹھی تھیں اور آگے بڑھ کر قد آدم کھڑکیں پر سے پردے ہٹا دیے۔ باہر

ٹھنڈی دوپہر پھیلی تھی۔ بادل بغیر بر سے چلے گئے تھے۔ اسے اب اس خاموش سی وحشت ہو رہی تھی۔ وہ صوفے کے قریب کھڑی تھی۔ سنٹرل ٹیبل

پڑے کچھ کاغذات کو دیکھ کر وہ گنگ رہ گئی۔ وہ اس کی ڈائری کے صفحات کی کاپی تھی۔ اپنی رائٹنگ وہ بخوبی پہچانتی تھی اور زرینہ بھی اس کے لکھنے کے

خاص انداز سے واقف تھیں۔ وہ ”لے“ کو لمبا کھینچ کر لکھتی تھی ایسے کہ سارا لفظ اس کے اوپر پڑا محسوس ہوتا تھا۔ صحیح معنوں میں زمین اب اس کے

پیروں تلے کھسکی تھی۔ بڑا سوچ سمجھ کر یہ سب زرینہ کے پاس بھیجا گیا تھا۔

”فرائڈے کو پریس کانفرنس ہے تب تک تمہیں یہیں رکنا ہوگا۔ فلم کی آڈیشنل اناؤنسمنٹ ہوگی۔ سب فیکلٹی ممبرز کا ہونا ضروری ہے۔“

فصل ٹوٹا وہ ششدر رہ گئی۔ ان کا لہجہ ٹھنڈا ٹھنڈا تھا۔ صلہ کے اعصاب جھنجھٹا اٹھے تھے۔ وہ اس کی جانب پشت کیے کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھیں۔

”مگر مجھے پریس کانفرنس سے ڈر لگتا ہے“ I cant face camera ”وہ بدقت تمام بولی تھی۔

”Really?“ ان کی ٹون میں واضح تمسخر تھا۔ صلہ کے اندر چھناکے سے کچھ ٹوٹا تھا۔ ”تمہیں تو خوش ہونا چاہیے۔ تمہارے official carer کا آغاز ہوا چاہتا ہے۔ یہی چاہتی تھیں نا تم۔“ وہ اس کے روبرو کھڑی سوال کر رہی تھیں۔ ان کی نظروں کی بدگمانی دیکھ کر وہ بے یقین سی ہو گئی۔ چند لمحوں کی خاموشی کے بعد وہ گویا ہوئی ”میں ایسا کچھ نہیں چاہتی تھی زرینہ۔ مجھے حیرانی ہو رہی ہے کہ لوگوں کو پہچاننے میں آپ کی حس آج کام کیوں نہیں کر رہی۔“ وہ بے یقین سی انہیں دیکھ کر رہ گئی۔ ”تمہی نے تو کہا تھا کہ انسان کو آپ نہ تو مکمل طور پر جان سکتے ہیں اور نہ ہی پہچان سکتے ہیں۔ اور اس بار میں نے واقعی پہچاننے میں غلطی کی۔“ زرینہ دکھ سے بولیں۔ کون سا ثبوت رہ گیا تھا اب۔ وہ اپنی غلطی ماننے کے بجائے الٹا انہی کی حس کو چیلنج کر رہی تھی۔ انکی نظروں میں بلا کا افسوس تھا۔ اعتبار ٹوٹنے کا افسوس۔ کیونکہ سامنے کھڑی لڑکی صفائی تک دینے کے موڈ میں نظر نہیں آ رہی تھی۔ وہ ایک جھٹکے سے مڑیں۔ اور صوفے پر پڑی ایک فائل اٹھا کر اس کی جانب بڑھائی۔ صلہ نے سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھا تھا۔ ”اس میں کچھ ضروری چیزیں ہیں انہیں نظر پڑھ لیجئے گا۔ پروجیکٹ کے حوالے سے کیا بتانا ہے اور کتنا بتانا ہے۔ سب اس میں لکھا ہے۔ کل آفس آ کر سرپرست اور دوسرے ڈاکومنٹ کو لیکٹ کر لیجئے گا۔ کانفرنس کے بعد دو ہفتوں میں کاسٹنگ کا کام شروع ہو جائے گا۔“ وہ نپے تلے انداز میں بریف کر رہی تھیں۔ زمانے بھر کی اجنبیت ان کے چہرے پر ثبت تھی۔ صلہ نے خاموشی سے فائل تھامی اور کچھ بھی کہے بغیر دروازے کی جانب بڑھ گئی۔ زرینہ اسے جاتا دیکھ کر رہ گئیں۔ دروازہ کھولتے وہ ہنسی تھی۔ جیک جو کب سے خاموشی سے سامنے صوفے پر بیٹھا دونوں کو دیکھ رہا تھا یکدم زور سے بھونکنے لگا۔ صلہ دل مسوس کر رہ گئی۔ اور تیزی سے دروازہ کھولتی باہر نکل گئی۔ وہ واپس صوفے پر آ بیٹھیں۔ اس نے جرم قبول نہیں کیا تھا تو صفائی بھی نہیں دی تھی۔ وہ بے اختیار دوسری فائل میز پر پٹختی باہر چلی گئیں۔ جیک نے حیرت سے انہیں جاتے دیکھا تھا۔ پھر صوفہ پھلانگ کر وہ ٹیبل پر آ گیا اور وہاں پڑے کاغذات سوگنھنے لگا۔ جانے اس کے ذہن میں کیا سمائی کہ وہاں پڑے سارے کاغذات اس نے منہ میں ڈال لیے اور انہیں چبانے لگا۔ باقی فائلیں وغیرہ نیچے کارپٹ پر جا گریں اور جیک صلہ کی ڈائری کے تمام کاغذات دھیرے دھیرے چباتا نکل گیا۔

☆.....

زرینہ کے گھر سے واپسی کا رستہ جیسے خواب میں گزرا تھا۔ آوازیں ہی آوازیں، شور ہی شور۔ وہ ریسٹ ہاؤس لوٹی تھی۔

”جہاں سے شروع کیا تھا وہیں واپس آ کھڑی تھی۔ جاتے وقت کیا کچھ اس نے نہیں سوچا تھا اور اب کیا تھا کچھ بھی نہیں۔“ وہ رکشے سے اترتی ریسٹ ہاؤس پر نظر پڑتے سوچ کر رہ گئی۔ پھر ڈرائیور کے یاد دلانے پر اس نے کرایہ دیا اور ٹکسٹ خوردہ سے قدم اٹھاتی اندر بڑھ گئی۔ اسے ہمارا انتظار کرنا تھا سو وہ وہیں ریسٹ ہاؤس کی سیڑھیوں پر بیٹھ گئی۔ اسے اس کے ساتھ آج تایا کے گھر چلے جانا تھا۔ نسیم بادی ہمارا اپنے اگلے پروجیکٹ میں کاسٹ کرنا چاہتے تھے اسی سلسلے میں وہ ان کے آفس گئی تھی۔

وہ سی ڈی کہاں سے آئی کس نے ریکارڈ کی۔ اور اس کی پرسنل ڈائری کے وہ صفحات کون دے سکتا ہے۔ اس کی الماری تک ہمارا دنیا کے سوا کس کی پہنچ ہو سکتی ہے۔ وہ چونگی۔ کہیں ان دنوں میں سے کسی نے..... ایسے بے ساختہ دنیا کا اس دن کا روٹا یاد آیا جب اعفان باری نے اسے انکار

کیا تھا۔ اعغان باری..... وہ یکدم ٹھکی۔ زرینہ کے گھر اس کا دماغ مفلوج ہو کر رہ گیا تھا۔ واقعی اس کا فائدہ صرف اعغان کو ہی ہو سکتا ہے تو کیا اعغان نے ندیا کی محبت دیکھے اسے ایکسپلائیٹ کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہ بے اختیار جھرجھری لے کر رہ گئی۔ ندیا سے اس کی دوستی زیادہ پرانی نہیں تھی۔ مگر اس کے باوجود وہ یہ یقین کرنے کو تیار نہیں تھی کہ ندیا نے یہ سب کیا ہے۔ اس نے سختی سے خود کو ٹوکا۔

زرینہ نے کبھی اس سے ایسے بات نہیں کی تھی۔ تب بھی نہیں جب وہ ایک دوسرے کے لیے اجنبی تھے اور اب وہ بے گانہ پن، بے اعتباری۔ لمحے بھر کو تو اسے خود پر شک سا ہوا۔ اس نے خود کو ٹٹولا "کیا واقعی زرینہ سے دوستی کے پیچھے میرا کوئی مفاد تھا۔" اندر سے کوئی جواب موصول نہ ہوا۔ گہرا سناٹا تھا۔ وہ سن رہ گئی۔ "نہیں مفاد جو بھی تھا یہ فلم تو کبھی میرے گول میں شامل نہیں تھی۔ بلکہ میرا کلوتا لالچ تو وہ مسودہ اور وہ کردار تھا جو دو سال سے مجھے اپنے حصار میں لیے ہوئے ہے اور زرینہ کے علاوہ وہ کردار کوئی نہیں کر سکتا اور اگر وہ کردار نہیں ہوگا تو کہانی بھی نہیں ہوگی۔" اس نے سفاکی سے سوچا تھا۔ "اگر فلم مل بھی گئی تھی تو شہرت کسے بری لگتی ہے۔" وہ مزید الجھ کر رہ گئی۔



اعغان باری سیٹی بجاتا خوش باش نسیم بادنی کے آفس میں داخل ہوا۔ وہ آج بے حد خوش تھا۔ پروڈیوسرز نے اسے زرینہ کی فلم میں اہم رول آفر کیا تھا اور خوشی سے وہ ادھر چلا آیا کیونکہ وہاں "وہ" تھی جسکی بدولت یہ سب ممکن ہوا تھا۔ وہ متمسم سا اس کے قریب چلا آیا جو اس کی پشت کیے فائلز میں کچھ دیکھ رہی تھی۔ نسیم صاحب کسی کام سے باہر نکلے تھے۔ کمرے میں وہ اکیلی ہی تھی۔ "میں نے کہا تھا نا یکدم رد عمل سامنے آئے گا۔ دیکھو سیکنڈ لیڈ (Second lead) کے لیے زرینہ نے خود میرا نام دیا ہے۔" وہ اس کے عقب میں کھڑا ہوا تھا۔ لڑکی چونک کر مڑی تھی۔ اس کی خوبصورت آنکھوں میں بے تحاشہ بے یقینی تھی۔ "اور یہ سب تمہاری مدد کے بغیر ہو ہی نہیں سکتا تھا۔" وہ مسکرایا۔ "مگر زرینہ نے صلہ کو کچھ نہیں کہا۔" کانٹریکٹ کی فائل ابھب بھ الماری میں ہے۔" لڑکی قدرے مایوس سی تھی۔

"بھی انہوں نے سوچا اگر صلہ ان کی دوستی کو ترقی کے لیے سیڑھی بنا سکتی ہے تو میری خوشامدی اور چالپوسی کیا بری تھی۔" وہ استہزائینہ ہنستا بیٹھ گیا۔ "وہ کتنی ہرٹ ہوئی ہوگی اس سب سے۔" وہ دیکھی سی لگ رہی تھی۔ "کم آن اس خوشی کے موقع پر ایسی باتیں نہ کرو۔ سب کو زندگی سے اپنے لیے دھنک کے رنگ کشید لینے کا حق ہے تو یہ احساس جرم کیسا۔" وہ اسے دیکھ کر رہ گیا جو بہت دیکھی لگ رہی تھی۔

"وہ رات بھر جاگتی رہی ہے اعغان..... روئی بھی ہوگی۔ تم نہیں جانتے اسے زرینہ سے راقبت نہیں عقیدت تھی۔" وہ متاسف سی کہتی کرسی پر بیٹھ گئی۔ "جو بھی تھا۔ عقلمند وہی ہے جو اپنے لیے خود مواقع بنائے ورنہ انسان ترقی نہیں کر سکتا۔ قدرت نے ہمیں یہ موقع خواہ مخواہ نہیں دیا تھا۔" وہ خوشدلی سے بولا چند لمحے خاموشی سے گزر گئے۔ اچانک وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور دروازے کی جانب بڑھ گئی۔ وہ دیکھتا رہ گیا۔

"کل وہ پاکستان آ رہا ہے اعغان....." وہ جاتے جاتے مڑی۔ وہ بے حد سنجیدہ لگ رہی تھی۔ اعغان مسکراتا اس کے پاس آیا۔

"Dont worry Huma" میرے والدین جلد ہی تمہاری طرف چکر لگائیں گے اور اس بار میں انکار نہیں سنوں گا۔" وہ جیبوں میں ہاتھ ڈالتا محبت سے بولا۔ ہمارے چہرے پر پھینکی سی مسکراہٹ درآئی۔ مضحک سی سوچوں میں گم وہ باہر نکل آئی۔ شرجیل سے انتقام لینے کے لیے اس

نے صلہ سے دوستی داؤ پر لگا دی تھی۔ دل خالی خالی سا لگ رہا تھا۔ ٹھنڈی ہوا بالوں کو اس کے صبح چہرے پر پھیلا رہی تھی۔ خلاف عادت اس نے انہیں سمیٹنے کا بھی تردد نہیں کیا۔ سینے پر بازو لپیٹے لب بھینچے وہ دھیرے دھیرے قدم اٹھا رہی تھی۔ اضطراب، بے چینی رگ و پے میں سرایت کر گئی تھی۔

اس کے کزن نے امریکہ میں شیری کی شادی کے پکے ثبوت بھیجے تھے۔ کیونکہ ویسے وہ اس خبر پر یقین کرنے کو تیار نہیں تھی۔ وہ پچھلے دنوں اپنی انگریز بیوی سے طلاق لینے کے تو کورٹ پکھری کے چکر لگا رہا تھا۔ اور اتفاقاً اس کی بیوی کا وکیل ہما کا ماموں زاد کزن تھا جو وہاں لاء پریکٹس کر رہا تھا۔ یہ بات شیری کے گھر والے بھی نہیں جانتے تھے۔ وہ اس لڑکی کو محض 2 سال بعد چھوڑ چکا تھا اور پاکستان آنے سے پہلے ہما کے والدین کو شادی کی تیاریوں کا کہہ کر گویا اس پر احسان عظیم کر رہا تھا۔ وہ تو ہمیشہ سے ایسا تھا۔ خود غرض، خود پسند اپنی ذات کے علاوہ اسے کسی کی پرواہ نہیں تھی۔

سب کچھ جاننے کے باوجود اس کے گھر والے اس شادی کے لیے تیار تھے کہ اب ان کے پاس اور کوئی آپشن نہیں تھا۔ مگر وہ اسے معاف کرنے کو تیار نہیں تھی۔ لہذا اعفان سے رابطہ کرنے پر اسے مایوسی نہیں ہوئی۔ وہ بھی سمجھ گیا تھا۔ کہ سب وہ شرجیل سے شادی ٹالنے کے لیے کر رہی ہے۔ مگر وہ بھی اتنی آسانی سے اسے چھوڑنے والا نہیں تھا۔ وہ تب بھی سچ میں اس سے شادی کرنا چاہتا تھا اور آج بھی وہ تیار تھا۔ لیکن اسی بہانے اسے فلم مل رہی تھی تو اس میں کیا حرج تھا بھلا۔ صلہ کو کانٹریکٹ ملے ابھی دو دن ہی ہوئے تھے جب اس کے گھر والوں کو شرجیل کی شادی کا علم ہوا تھا۔ اس کے کزن نے براہ راست اسے بتایا تھا اور اتفاقاً انہی دنوں صلہ کی ڈائری اس کے ہاتھ لگی تھی۔ تو کیا قدرت اسے شیری سے بدلہ لینے کا موقع خود فراہم کر رہی تھی۔ جس شخص کے لیے اس نے سات سال بنواس کا ٹاس کی بے وفائی کا جواب بہر حال وہ اس سے بہتر نہیں دے سکتی تھی۔ اعفان کی فطرت سے وہ بخوبی واقف تھی۔ ڈائری دیے بغیر وہ ٹلنے والا نہیں تھا اور نہ ہی اس کے بغیر وہ اس کا کام کرنے والا تھا۔ خود وہ بھی زرینہ کی طرف سے پر اعتماد تھی۔ ان کا غصہ آج یا کل اتر ہی جانا تھا۔



وہ چیئر کی پشت سر نکائے کسی گہری سوچ میں گم تھی۔ شفاف سیاہ نظریں چھت پر نکلی تھیں۔ ان کی پروقاری شخصیت ایسے بے نیازی میں اور بھی دلکش محسوس ہوتی تھی۔ سامنے بڑے سے میز پر بند فائل تھی اور ساتھ ہی نازک سے فریم لیس گلاسز دھرے تھے۔ دروازے پر ہلکی سی دستک پر چونک گئیں۔ گلاس ڈور کے پار کھڑی صلہ کو دیکھ کر نا محسوس انداز میں انہوں نے سامنے پڑی فائل کھول لی۔ وہ متذبذب سی اندر داخل ہوئی۔ گلاسز لگائے انہوں نے خواہ مخواہ صفحات پلٹے۔ صلہ کے مطلوبہ ڈاکیومنٹس پہلے سے ہی نکال کر میز کے دوسرے کنارے رکھے گئے تھے۔

”مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے۔“ اس کے لہجے میں پنہاں التجا پر انہوں نے پل بھر کو سراٹھایا۔ لائٹ پنگ شکن زدہ لاٹک شرٹ اور دھلا چہرہ بھی اس کے وجود کی بشارت ظاہر کرنے سے قاصر تھا۔ آنکھیں متورم سو جھی ہوئی لگ رہی تھیں۔ وہ ایک دن میں صدیوں کی پیار لگ رہی تھی۔

”مجھے آپ کی یہ امانت واپس کرنی تھی۔ یہ آپ کی فائل۔ ان کی دی ہوئی فائل کے ساتھ اس نے آہستگی سے ایک سرخ کور والی فائل بھی رکھی۔“ اور کانٹریکٹ۔

”Please do consider eligible one. I don't think i'm too suitable for this job“

اس کا لہجہ بے تاثر تھا۔ زرینہ نے قدرے برہمی سے اسے دیکھا۔ ان کا انداز سوالیہ تھا۔ اس نے کانٹریکٹ کی فائل کھولی اور کچھ صفحات الگ کیے اور کچھ پیچھے۔ پھر ان کے سامنے مؤدب سے انداز میں کھول کر رکھ دی۔ زرینہ نے ایک بے توجہ نگاہ اس پر ڈالتے فائل پر مرکوز کی۔ تو وہ ٹھٹھک گئیں۔ دستخط والا خانہ بالکل خالی تھا۔ یہیں نہیں بلکہ باقی دو جگہ بھی دستخط نہیں تھے۔ بلاشک صاف ستھرے صفحات ان چھوا ہونے کی چغلی کھا رہے تھے۔ انہوں نے متاسف سی بے یقین اسے دیکھا۔ اس بات میں کوئی شک نہیں تھا۔ کہ اس نے کسی میڈل کی طرح وہ فائل سجا کر رکھ دی تھی انہیں چند لمحے سمجھ ہی نہ آیا کہ اس بات پر کیا رد عمل ظاہر کریں۔

”مجھے آپ کی فلم یا کیرئیر سے کبھی کوئی غرض نہیں تھی اور یہ فائل میرے لیے کسی اعزاز سے کم نہیں تھی۔ کیونکہ جنہوں نے مجھے یہ فائل دی تھی انہیں مجھ پر دوست ہونے کی حیثیت سے بھی اعتبار تھا۔ اور جب وہ ہی نہیں رہا تو اس فلم سے نام بنا کر مجھے کیا کرنا ہے۔“ وہ بڑے متوازن انداز میں مخاطب تھی۔ زرینہ کو یکدم اشتعال آیا۔ یہ سب اس کے لیے مذاق تھا۔ ”اپنی ذاتی اور پروفیشنل زندگی کو الگ رکھنا سیکھو.....“ وہ بے حد روکھے لہجے میں گویا ہوئی۔

"I am not trying at all" اس نے بڑے اطمینان سے ٹوکا تھا۔

"I am an emotional fool" دونوں ہاتھ پشت پر باندھے اس کا انداز ہر جذبے سے عاری تھا۔ زرینہ اسے دیکھ کر رہ گئیں۔ پرسوج نظروں سے اسے ٹٹولتے انہوں نے چیئر کی پشت سے ٹیک لگائی۔ جانے کیوں انہیں لگا کہ اس کے پیچھے کوئی اور وجہ بھی ہے۔

”اس بچکانہ حرکت سے تم نے مجھے بڑا مایوس کیا ہے صلد۔“ وہ دکھ سے بولیں۔ ”جانتی ہوں۔“ اس کی آواز بھرا گئی۔ ”لیکن یہ بھی سچ ہے کہ ہمارے درمیان آفیشل تعلق کبھی نہیں تھا اور نہ ہو سکتا ہے۔“ زرینہ کہنیاں میز پر ٹکائے ہاتھ باہم پھنسائے کرب سے اسے جانا دیکھتی رہیں۔ اس نے آج بھی کوئی صفائی نہیں دی تھی۔ انہیں اس ریکارڈنگ سے زیادہ اس کے لکھے لفظوں نے تکلیف پہنچائی تھی۔ مگر صلد کے رویے نے انہیں عجیب الجھن میں ڈال دیا۔



”بالاج تم شادی کیوں نہیں کر لیتے۔ آدرش کی حالت پر ذرا رحم نہیں آتا تمہیں۔“ بی بی جان گاؤں سے اس کے پاس چند رہنے آئی تھیں اور ہمیشہ کی طرح ان کا ایک ہی بات پر اصرار ہوتا تھا۔ ”مناہل سمجھدار ہے اپنا خیال رکھ سکتی ہے مگر پھر بھی وہ ہے تو 7 سال کی بچی ہی نا۔ اور کیا آدرش کو تمہارا مناہل کی طرف زیادہ جھکاؤ نظر نہیں آتا ہوگا۔ وہ اپنی ماں کی کاپی ہے اسکی سزا تم اس ننھے سے بچے کو کیوں دیتے ہو۔“ بالاج بمشکل اپنی بے زاری چھپائے بیٹھا تھا۔ وہ بچوں کی کسڈی کاکیس جیت چکا تھا۔ ہادیہ نے جانے سے پہلے آدرش سے ملاقات کی تھی اور کیس ہارنے کا انتقام لینے کے چکر میں اس نے اس معصوم کا ذہن باپ کی طرف سے بھی میلاد کر دیا تھا۔ اس دن کے بعد سے آدرش نے کھانا پینا سب چھوڑ رکھا تھا۔ اگر بالاج کی والدہ (بی بی جان) اسے آکر نہ سنبھالتیں تو شاید وہ کسی کے قابو میں نہ آتا۔ اس کی محرومی اور بھی بڑھ گئی تھی۔ یہ بی بی جان کی انتھک محنت اور محبت اور ہی نتیجہ تھا جو وہ زندگی کی جانب لوٹا تھا۔ مگر وہ کب تک اسے سنبھالتیں۔

”ہر انسان کی زندگی میں کوئی نہ کوئی کمی ہوتی ہے۔ اسے بھی اس کمی کے ساتھ جینا ہوگا اور کیا گارنٹی ہے کہ میں جس سے شادی کروں گا وہ میرے بچوں کو ماں کا پیار دے پائے گی۔ یہاں تو سگی مائیں بھی اپنے خوبصورت اور ہونہار بچوں کو دوسرے کم صورت بچوں پر فوقیت دیتی ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ منابل میرا پوتہ ہونے کے باعث مجھ جیسی محرومی کا شکار ہو جائے۔ آدرش لڑکا ہے اسے سنبھلنا پڑے گا اور مجھے یقین ہے بڑا ہونے کے ساتھ ساتھ وہ سمجھ جائے گا۔ آپ کو میرے بچوں کی فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ کے گدی نشین ہونہار بیٹے ہیں نا ان کی فکر کیجئے۔ ہمیں ہمارے حال پر چھوڑ دیں۔“ وہ تلخی سے کہتا اٹھ گیا اور لمبے ڈگ بھرتا سیڑھیاں پھلانگتا آدرش کے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔ بی جان دکھ سے اپنے شاندار بیٹے کو جاتا دیکھتی رہ گئیں۔ ان کے چار بیٹے ہی ان کی کل کائنات تھے۔ انہیں یاد نہیں پڑتا انہوں نے کب باقی تین بھائیوں کو بالاج پر فوقیت دی تھی۔ وہ رنگ روپ میں اپنے تینوں بھائیوں سے کم ضرور تھا مگر اس کی پرسنالٹی کے آگے وہ بھی کم لگتے تھے۔ بچپن سے آج تک ان کے خاندان نے اس کے بھائیوں کو خوبصورت ہونے کے باعث ہاتھوں ہاتھ لیا تھا۔ اور بالاج نے یہ رویہ دیکھ کر لوگوں سے چھپنا شروع کر دیا تھا۔ وہ گہری سانس لیتے سر تھام کر بیٹھ گئیں۔ اسے آخری دفعہ انہوں نے اس کی شادی پر بے تحاشا خوش دیکھا تھا۔ ہادیہ کے جوڑ کا خاندان بھر میں کوئی کزن نہیں تھا سوائے بالاج کے۔ اس نے مجبوراً اس سے شادی کی تھی۔ مگر بالاج محنت پانے کی خوشی سے سرشار تھا۔ دنیا جہان کی آسائشیں اس نے ہادیہ کے قدموں میں لا کر رکھ دی تھیں اس کے باوجود کبھی خوش نہیں ہوئی تھی۔ منابل کی پیدائش پر وہ اور بھی دکھی ہو گئی کہ وہ ہو بہو بالاج پر پڑی تھی۔ شکھ نقوش گہری سانولی رنگت۔ مگر اسے اس ماں کا پیار بہر حال نصیب ہو گیا تھا جو آدرش کو نہیں ہوا تھا۔ وہ محض سات ماہ کا تھا جب وہ اسے چھوڑ کر بالاج سے طلاق لے چکی تھی اور ایک مڈل کلاس مگر خوبصورت مرد سے شادی کر لی جو اس کا کلاس فیلو رہ چکا تھا۔ اب اسے خوبصورتی کے ساتھ ساتھ دولت بھی چاہیے تھی سو بچوں کی کسٹڈی کے بہانے وہ کروڑوں کی جائیداد پانا چاہتی تھی جو ان کے پیدا ہونے پر ان کے دادا نے ان کے نام کی تھی۔ بالاج کو سنبھلنے میں ایک عرصہ لگ گیا اور اس دوران آدرش آیا کے رحم و کرم پر رہا۔ اس نے ہادیہ سے نفرت کرنے کے چکر میں آدرش کو خود سے بہت دور کر دیا اور گاؤں سے شہر چلا آیا۔ یہاں اس feild میں نام کمانے کے لیے انتھک محنت کرنے لگا جس میں خوبصورتی کو ترقی کی ضمانت سمجھا جاتا تھا۔ پہلے ماڈلنگ اور پھر ڈرامہ انڈسٹری۔ آج کے ویل گروڈ، ویل ڈریسڈ بالاج اور پندرہ سال پہلے والے بالاج میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ وہ اب آدرش کے ساتھ زیادہ وقت گزارنے لگا تھا۔ تاکہ یہ روز روز کی شادی کی اصرار کے جج جج سے جان چھوٹے۔ وہ اپنی زندگی میں اپنی مرضی سے انجوائے کرنا چاہتا تھا۔ شادی کر کے وہ اس آزادی کو ختم نہیں کرنا چاہتا تھا جو اس کی ٹین ایج میں اس کی شادی کرا کے اس سے چھین لی گئی تھی۔

☆.....

یہاں کراچی میں کام ختم ہو چکا تھا لہذا وہ نسیم بادی سے ملنے کی غرض سے ریسٹ ہاؤس چلا آیا۔ آدرش کے ضد کرنے پر وہ اسے بھی ساتھ لے آیا تھا۔ یہاں سے فارغ ہو کر منابل کو سکول سے پک کر کے ان کا آخری دن کراچی گھومنے کا ارادہ تھا اور پھر فلائٹ سے پہلے رات کو ایک ابھرتی اداکارہ آرزو کے ساتھ ہوٹل میں ملاقات تھی۔ جو اس کی یونیورسٹی فیلو بھی رہ چکی تھی۔ اس وقت شادی شدہ ہونے کے باعث اسے ہادیہ کے علاوہ کوئی دوسری نظر نہیں آئی تھی۔ مگر آرزو انگور کرنے والی چیز نہیں تھی۔ وہ مہتمم سا گاڑی لاک کرتا اس کے خوبصورت سراپے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔

آدرش کا ہاتھ تھامے چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا وہ ریسٹ ہاؤس کی پچھلی جانب جا رہے تھے۔ آدرش کے لیے کچھ کھانے کو لینے وہ کینٹین کی طرف جا رہے تھے۔ صبح سے موسم ابراؤد تھا۔ چند موٹی موٹی بوندیں پڑتے یکدم تیز بارش شروع ہو گئی تھی۔ آج کی ملاقات خوب رہے گی۔“ موسم کی بے ایمانی دیکھ وہ دل دل میں سوچ کر رہ گیا۔ مگر وہ قدم چلتے وہ ٹھنک کر گیا۔ آدرش اپنی چھوٹی سی چھتری کھول کر اپنے اوپر تانے پھر سے باپ کا ہاتھ تھام چکا تھا۔ وہ آج کل بمشکل ہی باپ کا ہاتھ چھوڑتا تھا۔ بالاج کور کے دیکھ اس کے اٹھتے قدم بھی رک گئے۔ اس کی نظروں کے تعاقب میں دکاھ وہ چونک گیا۔ ان کی جانب نیم رخ کیے سیڑھیوں پر بیٹھی وہ صلع ہی تھی۔ برستی بارش سے بے نیاز بنا پلک جھپکے سامنے دیکھ رہی تھی۔ بالاج کی گہری نظریں اس کے نبھکتے وجود پر جمی تھیں۔ آدرش کے ہلکے سے ہاتھ ہلانے پر وہ یکدم چونکا تھا۔ آدرش نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اجازت چاہی۔ اس کی نظروں کی التجاء پر وہ گہرا سانس لے کر رہ گیا اور جیسے ہتھیار ڈالتے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا وہ کھل اٹھا اور چھوٹے چھوٹے قدم بڑھاتا صلع کی جانب بڑھ گیا۔ کینٹین بند تھی اور لمبے سے کوریڈور کے عین وسط میں تھی اس کے آگے چھوٹی سی سیڑھیوں پر صلع بیٹھی تھی۔ آدرش کوریڈور پار کرتا صلع کے عقب میں جا کھڑا ہوا تھا۔ اور اپنی ننھی سے چھتری اس کے اوپر پھیلا دی۔ مگر وہ ہر چیز بے نیاز ہنوز سامنے دیکھ رہی تھی۔

”کیسا عجیب رشتہ تھا ان دنوں کا کہ جب بھی جہاں بھی ضرورت پڑے دونوں ایک دوسرے کو تسلی دینے پہنچ جاتے تھے“ وہ سوچ کر رہ گیا۔ اس کے ذہن سے سب نکل گیا تھا۔ وہ بے اختیار سامنے ان دنوں کو دیکھ گیا۔ وہ یہ بھی بھول گیا کہ وہ یہاں کیوں آیا تھا اور اس کے بعد اسے کہاں جانا تھا۔ وہ ایک ٹک برستی بارش میں کھڑا وہ منظر دیکھ گیا جو کس قدر مکمل لگ رہا تھا۔ بارش میں بھپکتی وہ اوٹ پٹانگ لڑکی اس وقت بالکل الگ لگ رہی تھی۔ دوپٹے کا ندھوں پر ہمیشہ کی طرح سلیقے سے پھیلائے حرن و ملال کی تصویر بنی کسی دیو مالائی منظر کا حصہ لگ رہی تھی۔ وہ لاشعوری طور پر اس کا موازنہ آرزو سے کر رہا تھا۔ آرزو سا مکش تھی خوبصورت تھی۔ سامنے بیٹھی لڑکی دلکش سراپے کی مالک تھی مگر اس کی سادگی اس وقت سب پر بھاری محسوس ہو رہی تھی۔ دفعۃً اس کا سیل فون بجا۔ اس کی عالم خواب میں جیسے فون اٹھایا تھا۔ نسیم بادی اس کا انتظار کر رہے تھے انہیں کہیں اور بھی جانا تھا۔ اس نے فون بند کر کے آخری نظر ان پر ڈالی اور پھر واپس مڑ گیا۔



”بظاہر بارش نارمل سی چیز ہے پانی کی چند بوندیں وہی چند بوندیں جو ہماری بلڈنگ کے پرنا لوں سے ہوتی ہوئی دریا میں جا گرتی ہیں۔“ لیکن یہی بارش جب پکاسون کے کیوس پر جلوہ افروز ہوتی ہے تو اس کی عامیت یکدم ختم ہو جاتی ہے۔ اسی طرح کہانی کے کردار زندگی کے معمولی سے کرداروں میں سے ہی ہوتے ہیں۔ جیسے عنایا جہانگیر، جیسے رمنا جیسے ابرار..... یہ سب عام سے کردار ہیں مگر صفحات پر ان کی کہانی آ جانے کے بعد یکدم خاص ہو گئے ہیں۔ میری کہانی میں کوئی ہیرو، کوئی ہیروئن اور کوئی ولن نہیں ہے۔ سب عام سے انسان ہیں، اپنی خواہشات کے پیچھے بھاگتے عام سے انسان۔ مگر عنایا جہانگیر میرے ماسٹر پیس کرداروں میں گنا جائے گا جب میں مر جاؤں گی۔“ زرینہ کونریشن دیتے وقت اسے اپنے ان بڑے بولوں کے اس قدر بڑے ہونے کا اور اک نہیں تھا۔ شاید یہ اس کے غرور کی سزا ہی تھی۔ جو اس نے اپنے ادنیٰ کام پر کیا تھا۔ کہیں دور زور کی بجلی کڑکی تھی۔ اس کی خالی خالی سی نظریں اپنے سے دو سیڑھیاں نیچے پھیلکتی اپنی فائل پر جمی تھیں۔ دو سال سے اس فائل میں بند لوگوں نے اسے اپنے حصار

میں لے رکھا تھا۔ اسے اپنے برف ہوئے احساسات پر حیرانگی ہو رہی تھی۔ اس کی دو سال کی محنت آب برد ہو رہی تھی اور اسے کوئی فرق نہیں پڑ رہا تھا۔ زرینہ کے بغیر وہ اس کہانی کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔ اپنے جذبات کی شدت کا اسے آج احساس ہو رہا تھا۔ بارش کی بوندوں کے ساتھ گرم پانی بھی روانی سے اس کی آنکھوں سے ہوتا چہرے پر بہہ رہا تھا۔ چہرے پر گیلے بال لٹوں کی مانند چپکے تھے۔ چہرے پر ہاتھ پھیرتی یکدم ٹھنکی۔ آنسوؤں کے ساتھ بارش کے پانی کی آمیزش نہیں تھی۔ اس نے چونک پیچھے دیکھا تو آدرش اس پر چھتری تانے جانے کب سے کھڑا بھیگ رہا تھا۔ لحظہ بھر کو دنگ رہ گئی۔ پھر اس کے بارش سے شرابور کپڑے دیکھ کر اس نے بے ساختہ اسے اپنی جانب کھینچ لیا۔ وہ ہنوز اس پر چھتری تانے اس کے برابر آکھڑا ہوا۔ ”کیا تمہاری ماما بھی کھو گئی ہیں شلا۔“ اس نے اسے اپنے قریب کر لیا کیونکہ چھتری دونوں کو شید دینے سے قاصر تھی۔ اس کے ماما کہنے پر اسے بے ساختہ یاد آیا تھا کہ کل شیریں آرہا ہے۔“ امی نے ابھی پرسوں ہی فون کر کے اطلاع دی تھی۔ وہ بہت خوش لگ رہی تھیں۔ اتنی خوش وہ پہلے کبھی نہیں تھیں۔ اس کے دل میں ہوک سی اٹھی تھی۔ گھر میں اس کی ضرورت پہلے بھی کچھ خاص نہیں تھی۔ اب شیریں کے آجانے سے رہی سہی کسر بھی پوری ہو گئی تھی۔ آدرش کی نظریں خود پر جمی دیکھ کر اس نے جلدی سے آنسو پونچھے۔

”کوئی بات نہیں شلا تم رولو..... پاپا کہتے ہیں رونا گندہیٹ ہے اس سے eyes اور ہارٹ میں پڑی ڈسٹ واش آؤٹ ہو جاتی ہے اور eyes بڑی بڑی اور پیاری لگتی ہیں۔“ اس کے ناصحانہ انداز پر اس کے آنکھوں کے گوشے پھر سے بھینگنے لگے۔ ”مگر زیادہ مت رونا ورنہ لوگ تمہیں تنگ کریں گے۔ مذاق اڑائیں گے تمہارا اور کوئی بھی تمہارے ساتھ نہیں کھیلے گا۔“ وہ اس کا چہرہ اپنے ہاتھوں سے پونچھتا بولا تھا۔ اس نے بے اختیار اسے بھینچ لیا اور پھوٹ پھوٹ کر رودی۔ اس کے ساتھ کھیلنے والی بھی آج غیر ہو گئی تھی۔ کاش وہ نسیم انکل کے آفس کی طرف نہ گئی ہوتی اور اعقان اور ہما کی باتیں نہ سنی ہوتیں۔ کچھ تو بھرم رہ جاتا۔ وہ اس قدر تہی دامن تو نہ ہوتی۔ آدرش اس کے ساتھ لگا اپنے ننھے ہاتھ سے تسلی دینے کے لیے سانداز میں اس کا کندھا تھپتھپا رہا تھا۔ اس کے رونے میں اور بھی شدت آگئی۔ بادل زور سے گرجے تھے۔ سب کچھ جیسے ریواسنڈ ہو رہا تھا۔ زرینہ کا اتفاقاً قلنا، ان سے دوستی ہونا اور پھر ان کے کھانے پینے اور دوا کا خیال رکھنا۔ ہر دم ان کے ساتھ رہنا، ان سے ایکٹنگ سیکھنا اور پھر ان کی ڈانٹ کھانا۔ ان کا وہ خوبصورت سا گھر اور ان کے جانور۔ ان کا ٹھنڈی اور ٹیکھی چیزیں کھانے سے پرہیز کروانا۔ اس کے چہرے کے تاثرات سے ان کا وہ پریشانی سمجھ جانا۔ پھر ان کی بے اعتباری وہ اجنبیت، آنکھوں کے رستے جیسے کراچی میں گزارا اب کی بار کا ایک ایک لمحہ باہر آ رہا تھا۔ ہما کے ساتھ گزارے وہ ماہ و سال، کتنی آسانی سے اس نے اس کے خوابوں کو توڑا محض شیریں سے بدلہ لینے کے لیے۔ اس سے شادی نہ کرنے کے لیے۔

آدرش نے اسے خود سے الگ کیا، اس کے آنسو پونچھے اور کسی بڑے کی طرح اسے تسلی دینے کے لیے سانداز میں ہاتھ پکڑ کر اٹھایا اور اس کا ہاتھ تھامے اپنے ساتھ لے گیا۔ بارش ہنوز تیز تھی۔ بادلوں کی گرج بھی ویسی ہی تند تھی۔ کینٹین کے سامنے اوپن ایئر چیمبر ز رکھنے جانے والا برآمدہ پانی سے بھر گیا تھا۔ صلہ کی فائل ہنوز تنہا سیڑھی پر پڑی بارش میں بھیگ رہی تھی۔

☆.....

انہیں کراچی سے آئے تین روز ہو چکے تھے اور تب سے ہمارے کمرے میں بند تھی۔ شیری کئی بار اس سے ملنے اس کے گھر کے چکر لگا چکا تھا مگر وہ ہمیشہ ملنے سے انکار کر دیتی تھی۔ شیری کی باہر شادی اور امریکہ میں اس کی سرگرمیوں کے بارے میں ہمارے گھر والے خاصے مشکوک ہو گئے تھے۔ اگر اس نے نیشنلٹی کے لیے شادی کی بھی تھی تو اسے اپنے گھر والوں سے بھی چھپانے کی کیا ضرورت تھی۔ جانے اور کتنی باتیں تھیں جو اس نے چھپائی ہوگی۔ ہمارے والدین اور بڑے بھائی اپنے طور پر جانچ کر وارہے تھے مگر اس رشتے سے بہر حال وہ مطمئن نہیں تھے۔ ایسی صورت میں اعفان باری کے پروپوزل نے انہیں سوچنے پر مجبور کر دیا تھا اور ہانے ڈھکے چھپے الفاظ میں گھر والوں تک اعفان کے سلسلے میں رضا مندی دے دی تھی۔ اعفان کے والدین اس ہفتے شادی کی تاریخ رکھنے اور انگوشی پہنانے آرہے تھے۔

دوسری طرف شرجیل کی شادی کی خبر کسی اور کے توسط سے ملنے کے باعث خود رحمان صاحب بھی اس سے خفا تھے جبکہ امی ہمارے گھر والوں کی طرف سے انکار کے بعد کبھی ہو گئی تھیں۔ انہوں نے ہمیشہ ہمارے کو اپنی بہو کی صورت دیکھا اور سوچا تھا۔

شرجیل کے لیے اس قسم کا انکار کسی دھچکے سے کم نہیں تھا۔ اس نے کبھی سوچا نہیں تھا کہ ہمیشہ سے اس کے نخرے اٹھانے والی، اس کا انتظار کرنے والی ہمارے جیسے ہمیشہ اس نے اپنا سمجھا اور شاید اپنی چیز سمجھ کر وہ کسی لاکر میں ڈال کر باقی چیزوں کی طرح بھول ہی گیا تھا۔ وہ اس طرح سے اس سے دور چلی جائے گی۔ امریکہ میں کی شادی کو اس کبھی اتنی اہمیت نہیں دی تھی کہ اس کا کسی سے ذکر بھی کرتا۔ وہ اس کے پاس کی بیٹی تھی اور اس کے لیے محض امریکہ میں سیٹل ہونے کا ذریعہ پڑھائی کے ساتھ پارٹ ٹائم جاب اس کی شاہ خیرچوں کے لیے ناکافی تھی۔ وہاں گزارا وقت صعبو بتوں سے پُر تھا۔ کئی بار جی چاہا واپس اپنے ملک بھاگ آگے مگر اب اسے کیے بڑے بڑے دعوے اور انا آڑے آجاتی تھی اور اب جب وہ سب کچھ حاصل کر چکا تھا تو زندگی کا سب سے اہم جوابی ہار گیا تھا۔ پاکستان آنے کا مقصد ہی فوت ہوتا نظر آ رہا تھا۔

سارا دن کمرے میں بند رہنے کے بعد تھوڑی دیر کو باہر آتا اور گرم سم سا بیٹھا رہتا۔ اس کی چھٹیاں ختم ہونے میں ہفتہ بھر ہی رہ گیا تھا۔ ابابہنوز ناراض تھے۔ البتہ خاندان بھر کا گھر میں تانتا سا بندھا رہتا تھا۔ جب سے سب کو ہمارے شادی اعفان سے طے ہونے کا پتہ چلا تھا تب سے تمام خاندان کی لڑکیوں کے ماں باپ کی نظر اس امریکن نیشنل خوبرو نوجوان پر تھی۔ وہ سب سے خوش خلقی سے ملتا مگر اندر اندر ہی وہ واپس جانے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ دادو کی طبیعت ناساز ہونے کے باعث وہ رکا تھا ورنہ کب کا جا چکا ہوتا۔

☆.....

تیز چلا لاتی دھوپ ہر سوچک رہی تھی۔ آنکھوں پر ہاتھ سے سایہ کیے وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی صلہ کے گھر کی جانب بڑھ رہی تھی۔ زرد فرائڈ ٹخنوں کو چھوتی زمین سے مس ہوتی محسوس ہو رہی تھی۔ بالوں کی چٹیا ایک کندھے پر دھری تھی۔ نسیم بادی کے فون نے اسے پریشان کر دیا تھا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ صلہ اس حد تک بے وقوف بھی ہو سکتی ہے۔ وہ نہ صرف اچھی آفرز ٹھکرا رہی تھی بلکہ نسیم بادی کے کام پر بھی اس کا دھیان نہیں تھا۔ دوسری طرف وہ اس بوجھ سے چھٹکارا چاہت تھی جو کراچی سے آنے کے بعد سے مسلسل کسی بھاری سل کی مانند دل پر دھرا تھا۔ آج چھٹی کا دن تھا۔ صلہ گھر پر ہی ہوگی۔ وہ کسی اور دن جا کر شیری کا سامنا نہیں کرنا چاہتی تھی۔

لاؤنج میں داخل ہوتی وہ یکدم ٹھہری گئی۔ پھر قدرے سنبھل کر گویا ہوئی ”آئی صلو گھر پر ہے؟“ اس کے سوال پر شیر کی آگے ناشتہ رکھتی عالیہ بیگم ٹھنک گئیں۔ ”ہاں اپنے کمرے میں ہوگی۔“ ایک نظر شیر کی کو دیکھتے وہ آہستگی سے کہتیں کچن کی جانب بڑھ گئیں۔ سیڑھیاں اوپر چڑھتے و مسلسل شیر کی گہری نظروں میں تھی۔ وہ جانتی تھی کمرے میں ہلکے میوزک کی آواز گونج رہی تھی۔ لحظہ بھر کو وہ رکی۔ کراچی سے واپسی کی فلائٹ کے بعد سے وہ صلو کو نہیں ملی تھی۔ اتنی ہمت ہی نہیں ہو رہی تھی۔ اس نے خود کو کچھ موز کیا۔ میوزک سننے کا مطلب تھا وہ نارمل تھی۔ ورنہ ڈپریشن میں وہ بالکل خاموشی سے اندھیرے کر کے بیٹھی رہتی تھی۔ دروازہ کھلتے ہی منی بیگم کے ابتدائیہ راگ نے کھلی باہوں سے جیسے اس کا استقبال کیا تھا۔ سامنے بیڈ پر لیٹ ٹاپ دھرا تھا۔ کمرہ بالکل خالی تھا۔ واش روم سے پانی گرنے کی آواز آرہی تھی۔ وہ رائیگ ٹیبل کی چیئر نکال کر بیٹھ گئی آج وہ ہر صورت اس سے بات کر کے جائے گی۔ حد ہوت پیے جذباتیت کی، ایسی بھی کیا آفت آن پڑی ہے کہ وہ یوں سب چھوڑ چھاڑ بیٹھ گئی ہے۔ زرینہ بچی تو نہیں ہیں۔ کچھ دنوں تک غصہ ختم ہو جائے گا انکا۔ اس نے خود کو گویا تسلی دی۔

”اے میرے ہم نشین چل کہیں اور چل

اس چمن میں اب اپنا گزار نہیں“

منی بیگم لہک لہک کر دہرائی تھیں۔ اس نے غزل کی دھن میں گم کر جیسے ٹینشن سے نجات حاصل کرنا چاہی۔ لیپ ٹاپ پر ریڈ بوکھلا چھوڑ کر وہ شاید نہانے چلی گئی تھی۔

بات ہوتی پھولوں تک تو سہہ لیتے ہم

اب تو کانٹوں پہ بھی حق ہمارا نہیں

وہ چونک سی گئی۔ لاشعوری طور پر وہ غزل کی جانب متوجہ ہوئی۔

”گلستاں کو لہو کی ضرورت پڑی

سب سے پہل ہی گردن ہماری کٹی

ہمانے بے چنی سے پہلو بدلا۔

”پھر بھی کہتے ہیں مجھ سے یہ اہل وطن“

وہ دم بخود رہ گئی اور اس انس رو کے اگلا جملہ آنے کا انتظار کرنے لگی۔

”یہ چمن ہے ہمارا، تمہارا نہیں“ وہ سن رہ گئی۔ یہی تو کہتے آئی تھی وہ اس سے بات اتنی سیدھی نہیں تھی جتنی اس سے سمجھی تھی۔ جانے کیوں اس شدید غلطی کا احساس اسے پہلے کیوں نہ ہوا۔ زرینہ کا رد عمل جو بھی ہوتا مگر وہ تو صلو کو جانتی تھی۔ یہ بھی جانتی تھی کہ اس کی نیت ایسی نہیں تھی اس کے باوجود اس نے اپنے مفاد کے لیے اس کی زندگی کا سب سے بڑا خواب چھین لیا۔ یہ بے معنویت جو اس کی زندگی میں آئی تھی اس کی سب سے بڑی وجہ زرینہ کی بے اعتباری نہیں بلکہ خود ہما کی بے وفائی تھی۔ دل پر پڑا بوجھ اور بھی بڑھ گیا تھا۔ اس کا سامنا کرنے کا خیال ہی سوہان روح تھا۔ وہ یکدم اٹھی

تھی۔ منی بیگم کی غزل ابھی بھی چل رہی تھی۔ وہ اسے ایموٹنل فول کہتی تھی اصل میں ایموٹنل فول تو وہ خود تھی۔ کتنی آسانی سے اعفان نے اس کے غم و غصے کو استعمال کیا تھا۔ اس کا دل یکدم بھر آیا وہ تیز قدم اٹھاتی دروازہ کھول کر باہر نکل گئی۔

.....☆.....

کشف آپنی ہمیشہ جیت جاتی ہیں۔ میں ان کے ساتھ اب نہیں کھیلوں گا۔“ وہ خفا خفا سا آئسکریم کھاتا بول رہا تھا۔ وہ ہتھیلی پر چہرہ نکالے اسے خاموشی سے جانے کب سے سن رہی تھی۔ بھاپ اڑاتی کافی یونہی پڑی تھی۔ وہ اب اکثر سکول سے واپسی پر صلہ کے گھر چلا جایا کرتا تھا۔ وہاں رائیل کشف کے ساتھ کھیلتا، امی کے ہاتھ کے کھانے کھاتا۔ ان کے گھر میں خوب رونق ہو گئی تھی۔ ”اچھا..... وہ تو کہہ رہی تھی کہ آپ چیٹنگ کرتے ہیں۔“ صلہ سادگی سے بولی۔

"She is lying" میں کبھی چیٹنگ نہیں کرتا بلکہ انہیں تو فٹبال بھی کھیلتا نہیں آتا۔ وہ مزید ناراض ہوتا کپ میں چیچ رکھتا بولا۔ صلہ نے مسکراتے نٹو سے اس کے منہ پر لگی آئسکریم پونچھی۔ ”ہلا تم کھلاؤ گی پلیز؟“ اس نے معصومیت سے فرمائش کی تو صلہ نے خاموشی سے ایک چیچ بھر کر اس کی طرف بڑھایا جو اس نے فوراً کھا لیا۔ ”اوہ نو بارش شروع ہو گئی۔“ کیفے کی کھڑکی سے برستی موسلا دھار بارش دیکھ کر وہ پریشان سی ہو گئی۔ ”کیوں بھی..... تمہیں تو بارش بڑی پسند تھی۔“ پاس بیٹھا کافی کاسپ لیتا شیریں حیران ہوا۔ ”بانیک پراتنی تیز بارش میں کیسے جائینگے۔“ وہ آدرش کو چھوٹے چیچ کھلاتی متھکری تھی۔ ”پھر کیا ہوا؟“ یہ جیکٹ ہے نا۔“ شیریں نے فخریہ اپنا جیزا پراتا کر سائیڈ پر رکھا۔

”تو؟“

”تو کیا تم نے وہ فلم نہیں دیکھ لی انام تھا اس کا..... ہاں عاشقی 2۔ جیکٹ چھتری کا کام دے گی۔“ وہ شرارت سے کہتا اسے دیکھنے لگا۔ صلہ نے ملا متی نظروں سے اسے نوازا۔

”ساری شرم امریکہ میں گوروں کے ہاتھ میں بیچ آئے ہو کیا۔“ وہ ہنس کر کافی کاسپ لینے لگا۔

وہ آدرش کو مال روڈ تک چھوڑ آئی تھی وہاں سے اسکا ڈرائیور اسے پک کر لیتا تھا۔ آج وہ حسب معمول اسے چھوڑنے کے لیے نکل رہی تھی جب شیریں ساتھ ہو لیا۔ بہنوں کو اکیلا وہ ویسے بھی نکلنے نہیں دیتا تھا۔ جب سے یہاں آیا تھا۔ پک اینڈ ڈراپ سرورس دے رہا تھا۔ بانیک پر وہ تینوں آدرش کی فرمائش پر آئسکریم پارلر گئے تھے۔ بالاج علی شاہ، آدرش کے صلہ کے گھر جانے سے واقف تھا۔ نا چاہتے ہوئے بھی اسے اجازت دیتی پڑی تھی۔ کیونکہ اس کے گھر وہ خاصا خوش باش رہتا تھا۔

داخلی دروازے سے بالاج اور آرزو کو داخل ہوتا دیکھ وہ جی بھر کر بد مزہ ہوئی۔ اس نے فرید بابا کو پارلر آنے کا بتایا تھا۔ بالاج غالباً راستے میں ہوگا سوا سے لینے آ گیا تھا۔ پہلے کبھی وہ اسے لینے نہیں آیا تھا۔ یا شاید وہ منائل کو آج خود سکول سے پک کرنے گیا ہوگا۔ صلہ نے اندازہ لگایا۔

”یہ وہی رقیب صاحب ہیں نا جنہوں نے ہمارے ساتھ کام کیا تھا۔“ انہیں آتا دیکھ کر شیریں نے صلہ کے کان میں سرگوشی کی۔ اس کا لہجہ عجیب سا تھا۔ صلہ نے چونک کر اسے دیکھا تھا۔ وہ بہت سنجیدہ تھا۔ وہ ان دونوں کے آنے پر بے ساختہ کھڑے ہوئے تھے۔ آرزو نے ایک مسکراتی نظر

ان پر ڈالی۔ ”آپ آج بلا اجازت اکیلے باہر نکلے ہیں ماسٹر۔ میں نے منع کیا تھا نا آج جانے سے۔“ ایک سپاٹ سی نظر ان دونوں پر ڈالتا وہ آدرش سے مخاطب تھا۔ آدرش جھٹ سے اٹھا تھا۔ ”سوری پاپا۔“

”چلے.....“ بالاج اس کا ہاتھ تھامتادروازے کی جانب بڑھ گیا۔

”بڑا ہی Rude آدمی ہے۔ بندہ تھینک یو ہی کہہ دیتا ہے۔“ شیری جیکٹ اٹھاتا بولا تھا۔ صلہ کوئی جواب دیے بغیر دروازے کی جانب بڑھی۔ رم، جھم پھواری پڑ رہی تھی اب تہ پہلے سی تیز مفتوحہ تھی۔ وہ دونوں پارکنگ کی جانب بڑھ گئے جہاں Blacj Honda Accord میں بالاج آرزو سنگ بیٹھا تھا، پیچھے آدرش اور یونیفارم میں ملبوس 7 سالہ منال بیٹھے تھے۔ شیری اسے جیکٹ پکڑاتا بائیک شارٹ کرنے لگا۔ نامحسوس انداز میں بالاج کی نظر ان پر پڑی تو واپسی کا راستہ بھول گئی۔ صلہ اس کی دی جیکٹ پہن کر دوپٹہ اپنے گرد اچھی طرح پھیلا چکی تھی۔

اس کی کسی بات پر اس نے مسکراتے اسے کندھے پر چپت رسید کی تھی اور پھر کندھا تھا سنبھل کر بیٹھ گئی۔ بالاج کی نظروں میں ناگواری سی در آئی تھی۔ اس نے یکدم گاڑی شارٹ کی اور تیزی سے آگے بڑھ لے گیا۔

”لگتا ہے میری باری اب بھی نہیں آئے گی۔“ آرزو نے اس کا یوں دیکھنا شدت سے نوٹ کیا تھا۔

”کیا مطلب؟“ وہ چونکا۔

”پہلے تمہاری بیوی، پھر بچے اور اب یہ لڑکی.....“ وہ آرزو کی سے مسکرائی۔

”کم آن..... ایسا کچھ نہیں ہے۔“ اس نے سختی سے تردید کی۔

”میں تمہیں یونیورسٹی کے زمانے سے جانتی ہوں۔ تمہاری آنکھوں کے ایسے ایک رنگ سے اچھی طرح واقف ہوں۔“ وہ ٹکان سے سیٹ کی پشت سے ٹیک لگائے گویا ہوئی۔ بالاج نے ایک نظر بچوں پر ڈالی۔ منال باہر دیکھنے میں مشغول تھی۔ جبکہ آدرش منہ لٹکائے بیٹھا تھا۔

”She is not my type“ بچوں کی جانب سے مطمئن ہو کر وہ آہستگی سے بولا تھا۔ ”مجھے بتا رہے ہو یا خود کو تسلی دے رہے ہو؟“

اس کی شہد آگئیں نگاہوں میں گہرا طنز تھا۔ وہ جھنجھلا گیا۔ ”ہم اس فضول ٹاپک پر کیوں الجھ رہے ہیں۔“ آرزو نے نظریں واپس وینڈسکرین پر جمادیں۔

”میں نہیں چاہتی کہ اس بار بھی تم میرے ساتھ وہ کرو جو تم ہمیشہ کرتے ہو۔ ہر چیز کی کشش تب تک برقرار رہتی ہے جب تک اسے

استعمال نہ کیا جائے۔ اس کا انداز معنی خیز تھا۔ بالاج کی آنکھوں میں مخصوص سی چمک ابھری تھی۔

”Use it, throw it and after that there will be no one between us“۔ وہ بے حد پراعتماد تھی۔

بالاج رخ موڑتے مسکرا دیا۔ اس کے چہرے پر آسودہ سی مسکراہٹ تھی۔ فاتحانہ مسکراہٹ۔ دوسروں کا غرور توڑنا، ان کا مذاق اڑانا اس کے پسندیدہ

ترین مشغلوں میں سے تھا۔



گھر پہنچتے ہی بڑے تایا کی گاڑی اپنے چھوٹے سے پورچ میں دیکھ کر وہ گہری سانس لے کر رہ گئی۔ بیگ کا سٹریپ کندھے پر جاتے اس نے لاؤنج میں بیٹھے لوگوں کو مشترکہ سلام کیا اور خاموشی سے اپنے کمرے کی جانب بڑھ گئی۔ ابھی کچھ دیر میں اسے کچن میں ہیلپ کروانے کی غرض سے بلوایا جانا تھا۔ ان کا چیف گیسٹ شرجیل ان کے درمیان موجود تھا۔

رحمان صاحب اکلوتی اولاد تھے اور آگے سے اٹکا بھی ایک ہی بیٹا تھا۔ بڑے تایا اور چھوٹے تایا ان کے ماموں زاد کزن تھے۔ لیکن خاندان بھر میں انہی دونوں کا حکم چلتا تھا۔ وہ پڑمردگی سے جوتے اتارتی کھڑکی کی جانب چل دی۔ اس کی کھڑکی کے سامنے ہمارے کمرے کی کھڑکی کھلتی تھی۔ یہ کمرے پہلے شرجیل کا تھا۔ کچھ بھی تو اس اپنا نہیں تھا۔ وہاں شادی کی تیاریاں عروج پر تھیں۔ ہمارا بار اسے منانے آئی تھی مگر اس نے یہ کہہ کر صاف انکار کر دیا تھا کہ اس بے وقوفی میں اس کا قطعاً ساتھ نہیں دے گی اور جو کچھ اس نے اس کے ساتھ کیا تھا وہ اتنی بھول جانے والا تو نہیں تھا۔ وہ یہ سب نہ کرتی تو آج وہ کسی گوٹھ کے گرد آلود گرمی سے بھرپور علاقے میں ہوتی مگر خوش ہوتی۔ فلم کی ہیروئن گوٹھ کے رہنے والی تھی اور لڑکا کشمیر کا۔ یاد کا خوبصورت جھونکا دل کو چھو گیا تھا۔ آنکھوں کے گوشے بھیگ گئے تھے۔

”صلہ نیچے آؤ جلدی سے۔“ میٹرھیوں کے سر پر امی کھڑے اسے آواز دے رہی تھی۔ اس نے سرعت سے آنسو پونچھے۔ ”جی آئی.....“ کہتی وہ واش روم میں چھینچ کرنے چلی گئی۔

رات کو کھانے کے بعد فارغ ہو کر وہ اوپر چلی گئی اس کے پیچھے شیری بھی چلا آیا۔ ”میں نے سوچا ذرا اپنے کمرے کا دیدار ہی کر لوں۔“ وہ کمرے پر طائرانہ نظر ڈالتا کھڑکی پر دونوں ہاتھ رکھے کھڑا ہو گیا۔

”کمرے کو دیکھنے آئے ہو یا اس بیوقوف کو۔“ سینے پر بازو لپیٹے وہ تلخی سے بولی تھی۔ وہ بھیکسی سی ہنسی ہنس دیا۔

”تم تو بچپن سے اس کی بیوقوفیوں سے واقف ہو۔ تم نے اسے نہیں روکا؟“

اس نے اچنبھے سے اسے دیکھا۔

”چائے پیو گے۔ لاؤں۔“ صلہ بے تاثر انداز میں بولی تو شیری چونک سا گیا۔

”میں نے رائیل سے کہہ دیا ہے وہ لے آگے گی۔ تم ادھر آؤ ذرا۔“ اس نے اسے کرسی پر بٹھایا اور خود سامنے بیڈ پر بیٹھ گیا۔ ”کیا بات ہے؟“

جب سے آیا ہوں دیکھ رہا ہوں کہ تم سارا سارا دن گھر سے غائب رہتی ہو۔ گھر میں ہوئی ہو تو کمرے میں بند رہتی ہو۔ یا پھر آدرش کے ساتھ لگی رہتی ہو۔ کوئی ناراضگی ہے کسی سے یا پھر مجھ سے ناراض ہو۔“ وہ سنجیدگی سے اپنی خوش مزاج بذلہ سنج بہن کو دیکھ رہا تھا جو بہت بدلی بدلی لگ رہی تھی۔ صلہ نے ایک سپاٹ سی نظر اس پر ڈالی۔ ”ایسا کچھ بھی نہیں ہے۔“ بولی تو بس اتنا۔

”یہ اسٹنٹ والا کام اتنا خواری والا ہے۔ چھوڑو اسے کوئی انسانوں والی جاب کرو۔ گھن چکر بنا رکھ دیا ہے نسیم انکل نے تمہیں اپنی طرح

کا۔“ وہ چڑ کر بولا۔

”یہ 05 to 9 والی جاب مجھ سے نہیں ہوتی۔ ڈاکٹری میں فیل ہوئی اتنا کافی ہے۔ مزید فیل ہونے کا میرا کوئی ارادہ نہیں ہے۔“ وہ جبراً

مسکرائی تھی۔ شیری اسے دیکھ کر رہ گیا۔ اس کی بچپن کی عادت ہنوز قائم تھی۔ اپنی پراہمز وہ کبھی شیر نہیں کرتی تھی۔

”امی..... جلدی آئیں دیکھیں دادو کو کیا ہو گیا ہے۔“ کشف کے چیخنے پر وہ دونوں ہڑبڑا کر اٹھے تھے۔ کشف کی چیخ سے پورا گھر گونج رہا تھا۔ وہ دونوں آگے پیچھے بیڑھیوں کی طرف بھاگے تھے۔ گیٹ روم سے تایا تائی بھی بھاگتے ہوئے دادو کے کمرے کی جانب گئے تھے۔

.....☆.....

ہسپتال کے سنگ مرمر کے کاریڈور میں موت کی سی ویرانی تھی۔ ڈاکٹر نے Sever ہارٹ ایک بتایا تھا اور دادو کو فوراً I.C. میں لے گئے تھے۔ دو گھنٹوں تک بائی پاس کرنے کے انتظامات ہو رہے تھے۔ ان کو ہوش میں لانے رات کے تین بج گئے تھے۔ بڑے تایا ان کا بیٹا عذیر، شیری سامنے دیوار سے ٹیک لگائے کھڑے تھے۔ صلہ اور عالیہ بیگم بھیکے چہروں کے ساتھ بیچ پر بیٹھے دل ہی دل میں دعائیں کر رہے تھے۔ ابا، دادو کے بلانے پر اندر گئے تھے۔ تین گھنٹے کی غنودگی سے اٹھنے کے بعد ڈاکٹرز کے سختی سے منع کرنے کے باوجود انہوں نے رحمان صاحب کو بلایا تھا۔ انکا سرخ و سفید چہرہ لٹھے کی مانند سفید پڑا تھا۔ وہ بدقت تمام بول پارہی تھیں رحمان صاحب ان کے ہونٹوں کے قریب کان کیے بمشکل سننے کی کوشش کر رہے تھے۔ کچھ دیر بعد وہ باہر آئے تو ان کے چہرے پر ناقابل فہم سا تاثر تھا۔ سب سوالیہ نظروں سے انہیں تکتے لگے۔ وہ کہنے کو الفاظ مجتمع کر رہے تھے۔ ”انہیں ایک ہی غم کھائے جا رہا ہے کہ انہیں ندگی میں انہوں نے اپنے بچوں کی کوئی خوشی نہیں دیکھی۔“ وہ رُکے۔ سب بے چینی سے ان کے بولنے کا انتظار کر رہے تھے۔ ”اسی لیے وہ چاہتی ہیں کہ آپریشن سے پہلے ان کے سامنے شرجیل کا نکاح ابھی اور اسی وقت ہمارے کر دیا جائے۔“ امی ایک جھٹکے سے کھڑی ہوئیں۔ سب حق دق رہ گئے خود شیری بھی بوکھلا کر رہ گیا۔ صلہ نے بیٹھے بیٹھے حیرانی سے سب کو دیکھا تھا۔

”لیکن پرسوں اس کی شادی ہے۔ ایسے کیسے ہو سکتا ہے۔“ عالیہ بیگم ہکلائیں۔ ”وشادی ہوئی تو نہیں نا۔“ وہ کہہ کر دوسری جانب چل دیے اور ثاقب صاحب کا نمبر ملانے لگے۔ سب ایک دوسرے کا منہ دیکھتے رہ گئے۔ اس سب سے لاتعلقی صلہ بیچ پر بیٹھی ساکت رہ گئی تھی۔ اس کے ذہن میں جھکڑ سے چل رہے تھے۔ آنسوؤں کے ساتھ سارے خواب گرتے بہتے چلے جا رہے تھے۔ محرومی، نارسائی کے کئی روز پرانے کرب کی اب جیسے انتہا ہو چکی تھی۔

آدھے گھنٹے میں ثاقب صاحب ہانپتے کانپتے بیگم چلے آئے۔ ان کے پیچھے چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی بڑی سی چادر لپیٹے ہمار چلی آ رہی تھی۔ وہ تین دن پہلے مایوں بیٹھی تھی۔ پورا گھر رشتے داروں سے بھرا تھا۔ اس پر خوب روپ چڑھا تھا۔ حزن و ملال کے تاثر نے اس کے معصوم سے حسن کو چار چاند لگا دیے تھے۔ وہ حیران پریشان سی سب کو دیکھتی صلہ کے پاس بیچ پر آ بیٹھی۔ شیری کنٹریں اس پر جم سی گئیں۔ مہندی سے بھرے سرخ و سفید ہاتھوں کی مخروطی انگلیوں کو بے چینی سے مسل رہی تھی۔ ستواں ناک پر ڈاؤنڈ نوزین بہت بھلی لگ رہی تھی۔

ابا ایک کونے میں ثاقب صاحب اور عالیہ بیگم کے ساتھ کھڑے تھے۔ ان کے چہرے پر اضطرابی کیفیت نمایاں تھی۔ تایا ابا جو خاموشی سے ان کی گفتگو سن رہے تھے یکدم فیصلہ کن انداز میں کچھ بولے تھے۔ ثاقب صاحب گہری سانس لیتے اثبات میں سر ہلا رہے تھے۔ تایا ابا نے فوراً عذیر کو بلایا اور ہلکے سے کچھ کہا۔ وہ قریبی مسجد کے پیش امام کو لینے باہر بڑھ گیا۔ بزرگوں کو آتا دیکھ شیری یکدم سیدھا ہوا تھا جیسے اس کی چوری پکڑی گئی ہو۔ صلہ ہنوز خاموش تھی۔

تبھی عالیہ بیگم ہما کا ہاتھ تھام کر اسے ایک طرف لے گئی۔ شیریں بغور اس کے چہرے کے بدلتے تاثرات دیکھ رہا تھا۔ جیسے جیسے عالیہ بیگم بتا رہی تھیں اس کا چہرہ سفید پڑتا جا رہا تھا۔ وہ ہلکے سے نفی میں سر ہلا رہی تھی۔ آنکھیں نم ہو گئی تھیں۔ اس نے شاکد سی نظروں سے بچ پر سکت بیٹھی صلو کو دیکھا تھا۔

دفعۂ عذریہ مع سوتے جاگتے مولوی صاحب کے منظر میں داخل ہوا تو کھلبلی سی مچ گئی۔ آپریشن کی تیاری مکمل تھی۔ وقت بہت کم تھا ابا نے ان دونوں کو آنے کا اشارہ کیا اور سب اندر دادو کے کمرے میں چلے گئے۔ عالیہ بیگم ہما کو کندھوں سے تھام کر اندر لے جا رہی تھیں۔ ہما بے بسی سے نم آنکھوں سے صلو کو دیکھ کر رہ گئی۔ شیریں جو اسے بغور دیکھ رہا تھا یکدم چونک سا گیا۔ وہ کچھ بھی سمجھنے سے قاصر تھا۔ اسے اندر ہلا رہے تھے وہ ایک نظر صلو پر ڈالتا اندر بڑھ گیا۔ عذریہ پہلے ہی جا چکا تھا۔ تایا ابا، امی، ابا اور ہما کے والدین کے سامنے شیریں اور ہما کا نکاح پڑھوایا جا رہا تھا۔ باہر وہ اکیلی بچ کے کناروں کو سختی سے جکڑے کنارے پر نکلی بے آواز زور رہی تھی۔ اندر دھڑکتے دل اور لرزتی آواز میں قبول ہے کی گردان کرتی ہما زندگی کے سب سے بڑے پچھتاوے کے احساس میں گھری تھی۔ اب زندگی بھر صلو کو منا نہیں پائے گی۔ دادو نقاہت زدہ نیم وا نگاہوں سے انہیں دیکھ رہی تھیں۔ ان کی نگاہوں میں عجب اطمینان تھا۔ ایسے وقت میں بھی انہیں اپنے لاڈلے پوتے کی تکلیف کا بھرپور خیال تھا، ساتھ ہی ساتھ یہ اطمینان بھی تھا کہ اب رحمان صاحب اور شیریں کے درمیان چھڑی برسوں پرانی سرد جنگ اختتام کو پہنچے گی۔ اب وہ سکون سے جاسکتی تھیں۔ نکاح کی رسم پوری ہوئی۔ سب عجیب گوگو حالت میں تھے۔ عذریہ نے ہی پہلے شیریں کو مبارک باد دی تھی اور پھر باقی سب بھی دھیمی آواز میں مبارکباد دیتے اٹھ گئے۔ ہما بے یقین سی بیٹھی تھی۔ دادو کی سانسیں یکبارگی اکھڑنے لگی۔ انکارنگ پیلا پڑ گیا تھا۔ اور وہ بری طرح کھانسی رہی تھیں۔ شیریں اور عذریہ کو ڈاکٹر کو لینے بھاگے۔ باہر بت بنی صلو بھی جیسے ہوش میں آئی تھی۔



آپریشن کا میاب رہا تھا اور دادو کو گھر لاتے ہی گھر میں شادی کے ہنگامے جاگ اٹھے تھے۔ ہما کی طرف سے مہمان پہلے سے آئے ہوئے تھے۔ رحمان اور عالیہ بیگم نے بھی خوب ارمان پورے کیے۔ سب کزنز شادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہے تھے۔ صلو خاموشی سے سب کام نمٹاتی اور کمرے میں چلی جاتی۔ اس نے کبھی سوچا نہیں تھا کہ اپنے اکلوتے بھائی اور بیٹ فرینڈ کی شادی میں وہ یوں غیروں کی طرح شریک ہوگی۔ وہ جلد از جلد گھر سے نکلنا چاہتی تھی۔ عجیب گھٹن کا احساس تھا جو اسے چاروں طرف سے اپنی لپیٹ میں لیے ہوا تھا۔ ابا اور شیریں کی ناراضگی ختم ہو گئی تھی اور دادو کو پھر سے اپنا ہنس کھ بیٹا اور پوتا مل گئے تھے۔

ہما کا انتظار رنگ لایا تھا اور وہ اعفان جیسے آدمی سے بچ گئی تھی۔ عجیب سا طوفان اٹھا تھا جو سب کی جھولی میں کچھ نہ کچھ ڈال گیا تھا۔ سب اپنی اپنی خوشیوں کے خول میں سمٹ چکے تھے۔ اور وہ تنہا باہر بھٹکنے کو رہ گئی تھی۔ وہ کافی دن بعد کام پر آئی تھی۔ کراچی سے آنے کے بعد کی بے معنویت ہنوز برقرار تھی۔ لکھنے بیٹھتی تو یوں لگتا جیسے سب فریب ہے دھوکہ ہے۔ کیا فائدہ کیا مقصد ہے بھلا لکھنے کا۔ کیا کرے گی وہ لکھ کر۔ چند صفحے کا لے کر کے کیا حاصل ہو جائے گا۔ گھر میں سب کے ساتھ بیٹھتی تو یوں لگتا جیسے سب ایک سکر ہڈ پلے کے تحت اپنی لاسز بول رہے ہیں۔ خواہ مخواہ ہنس رہے ہیں۔

کوئی ایک لفظ بھی تو ہمارا اپنا نہیں ہے۔ لکھنے والے نے بہت پہلے اس سٹیج کا اہتمام کرتے وقت اس کی ابتداء اور اختتام لکھ ڈالا ہے۔ وہ سوچوں میں گم سڑک کے کنارے چل رہی تھی۔ یہاں سے کچھ فاصلے پر سٹوڈیو واقع تھا وہ جان بوجھ کر پچھلے سٹاپ پر اتری تھی اور سر جھکائے پیدل یونہی چلی آرہی تھی۔ زندگی پر چھائے جمود کو توڑنے وہ نسیم بادی کے پروجیکٹ میں خواہ مخواہ شریک ہو گئی تھی۔ انہی سوچوں میں غلطاں وہ پارکنگ سے گزر رہی تھی کہ کوئی اچانک مڑتے مڑتے اس سے ٹکرایا تھا۔ اس سے لگا وہ کسی پہاڑ سے ٹکرا گئی ہے۔ فائل اور پیپر دور جا گرے تھے۔ وہ بمشکل سنبھلتے بے اختیار سر تمام کر رہ گئی۔ ”دیکھ کر نہیں چل سکتے۔“ وہ ناک اور ماتھا سہلاتی چڑسی گئی۔

”یہی بات میں بھی کہہ سکتا ہوں محترمہ۔“ بالاج گاڑی کا لاک چیک کرتا اسی چیز سے بولا تھا۔ وہ قدرے چونک کر ایک سر دنگاہ اس پر ڈالتی اپنی چیزوں پر جھک گئی۔ بالاج خاموشی سے اسے چیزیں اٹھاتا دیکھتا رہا۔

چیزیں اٹھاتی وہ ایک طرف سے نکلنے لگی کہ بالاج رستہ روک وپیں کھڑا تھا۔ ”کیا مسئلہ ہے؟“ وہ زچ ہو کر غصے سے بولی تھی۔ بالاج کو خاصی حیرانگی ہوئی وہ تو ہوش و حواس میں ہوتے ہوئے بھی ڈرے بغیر اس سے بات نہیں کرتی تھی۔ ”اس دن کیفے میں تمہارے ساتھ کون تھا۔“ دل میں اٹھتا سوال زبان کی نوک تک اچانک آیا تو صلہ کے ساتھ خود وہ بھی چونک سا گیا۔

”آپ سے مطلب۔“ صلہ ابرو اچکا تکی ناگواری سے بولی۔

”مجھے پتہ ہونا چاہیے کہ میرے بچے کس قماش کے لوگوں میں وقت گزارتے ہیں۔“ اس کے سنجیدگی سے کہنے پر صلہ تپ کر رہ گئی۔ ”کہہ کون رہا ہے۔“ وہ بے ساختہ خود کلامی کے سے انداز میں بولی جو بالاج نے واضح سنی تھی۔ اس کی تیوریوں پر بل پڑ گئے۔

”اپنی چیزیں خود جان بوجھ کر خراب کرتی ہو یا فطرتاً ایسی ہو۔“ اس کے سرد سے لہجے میں کہے الفاظ پر اس نے اس کی نظروں کے تعاقب میں دیکھا تو اس کا والٹ نیچے قدرے دور جا گرا تھا۔ وہ خفیف سی ہوتی والٹ پر جھک گئی۔

”اعضان جیسے الو کی باتوں میں بھی کوئی آسکتا ہے وہ بھی اتنی آسانی سے۔“ یہ مجھے نہیں پتا تھا۔“ وہ زیر لب مسکراتا بولا۔ صلہ نا سمجھی کے عالم میں اسے ہنسنے لگی۔ ”کم از کم ہمارے مجھے ایسی امید نہیں تھی۔ یا پھر یہ عورت نامی مخلوق ہوتی ہی عقل سے پیدل ہے۔“ وہ بڑے اطمینان سے اس پر چوٹ کرتا بولا تھا۔ وہ یکدم سیدھی ہوئی تھی۔

”آپ سے بحث کرنے کا مجھے کوئی شوق نہیں۔ آپ نے جو سمجھنا ہے سمجھیں۔ آپ کو ویسے بھی دوسروں پر ہنسنے کا موقع چاہیے۔“ وہ خلاف توقع بھڑکی نہیں۔ بلکہ بڑے متوازن انداز میں بولی تھی۔

”ذرا سی بات پر سنہرا موقع ٹھکرا دینا بیوقوفی نہیں تو اور کیا ہے؟“ وہ قدرے سنجیدگی سے بولا تھا۔

”آپ کے لیے ہر بات معمولی ہوتی ہوگی میرے لیے نہیں ہوتی۔“ وہ سائیڈ سے ہوتی نکلی پھر یکدم مڑی تھی۔ ”اور ہاں بے فکر رہیے اب میں آپ کے بچوں سے کبھی نہیں ملوں گی۔ انہیں اپنے گھر کے شریفانہ ماحول میں سنبھال کر رکھیں بظاہر وہ طنز یا بولی مگر دل پر بھاری پتھر سا آ پڑا تھا۔ ایک آدرش ہی تو تھا اس گھٹن زدہ ماحول میں ایک روزن کی طرح۔ وہ چند لمحے سوچ کر رہ گئی۔ اب راہ فرار کہاں تلاشے گی۔ بالاج اس کے قریب آیا۔

”کسی نے ایک بار کہا اور تم نے فوراً چھوڑ دیا۔ تم اتنی سیدھی ہو یا بنتی ہو۔ صلہ نے ایک بیزار سی نظر اس پر ڈالی۔ وہ گہری نظریں اس پر مرکوز کیے ہوئے تھا۔ اس نے بے اختیار نظریں چرائی تھیں۔ اس کے دیکھنے کا انداز عجیب سا تھا۔ ”کہاں تو یہ عالم تھا کہ نسیم کے کام پر شریک نہ ہوتے ہوئے بھی حق سے سب پر رعب جماتی ہو اور کہاں ذرا سی بات پر زربہ اور اب آدرش کو بھی چھوڑنے کو تیار کھڑی ہو..... خاصی بیوفا معلوم ہوتی ہو۔“ وہ سینے پر بازو لپیٹے سامنے کھڑی لڑکی کو نظروں میں جذب کرتا ہوا۔ صلہ نے یکدم سر اٹھایا اس کی نگاہیں بھیگ گئی تھیں۔ وہ ٹھٹک سا گیا۔ پھر سر جھٹک کر استہزائیہ کہہ کر ہنس دی۔ ”جو چیز اپنی ہی نہ ہو اس پر کیا حق جمانا۔“ وہ رکی نہیں بالاج کو بے اختیار افسوس سا ہوا۔ یہ ساڑھے پانچ فٹ کی لڑکی اس کے چار سالہ بیٹے کی بیسٹ فرینڈ تھی۔ اگر وہ اس سے نہیں ملے گی تو وہ ادا اس ہو جائے گا۔ وہ سوچ کر رہ گیا۔

سارا دن کام میں مصروف ہونے کے باوجود اسے کسی کی گہری نظریں خود پر جمی محسوس ہوتی رہیں مگر وہ جب بھی ادھر ادھر دیکھتی تو سب کاموں میں مصروف ہوتے۔ وہ سر جھٹکتے کام میں لگ جاتی۔ مگر یہ احساس ہنوز قائم تھا۔ ویسے بھی دل بوجھل سا تھا۔ آدرش سے نہ ملنے کا مطلب وہ بخوبی سمجھتی تھی۔ ہر پسندیدہ چیز چھوڑ دینے کی شاید عادت سی ہو گئی تھی۔



”آپ کو دادی بلارہی ہیں آپ۔“ صلہ الماری کھولے کھڑی تھی جب کشف اندر داخل ہوئی۔

”اچھا آتی ہو۔“ وہ الماری بند کر کے اس کے ساتھ باہر نکل آئی۔

”آپ آج کام پر نہیں گئیں۔“ کشف نے سرسری سا پوچھا۔ وہ اس سے آگے اترتی پل بھر کو پوچھنے لگی۔

”ہاں بس موڈ نہیں تھا۔“ اس کے کہتے وہ کندھے اچکاتی نیچے بھاگ گئی جہاں لاؤنج میں ٹیبل پر ہما اور امی کپڑے پھیلائے بیٹھی تھیں۔ وہ اچنتی نگاہ ان پر ڈالتی آگے بڑھ گئی۔

”صلہ یہ سوٹ دیکھو۔ اچھا ہے نا۔“ اس کو جاتا دیکھ کر امی پکارا تھیں۔ وہ لمحہ بھر کو مڑی۔

”آپ کی بہو ہے نا اس سے پوچھیں۔“ اس کے سپاٹ سے انداز پر کہنے پر وہ دونوں چونکیں ہمانے چونک کر اسے دیکھا تھا۔ جولا تعلق سی کھڑی تھی۔ امی ہنس دیں۔

”بھئی یہ بہو بعد میں ہے پہلے تمہاری دوست ہے۔ تمہی تو کہتی تھیں۔ بھول گئی کیا؟“ وہ بشاشت سے بولتیں دوسرا سوٹ اٹھا کر دیکھنے لگیں۔

ہما کی نظروں میں خوف سا بھرا آیا۔ وہ پھینکی سی ہنس دی۔ ”کاش بھول سکتی۔“ کہہ کر وہ تیزی سے دادو کے کمرے کی جانب چل دی۔ ہما بے بسی سے اسے دیکھ کر رہ گئی۔ اس کی شادی کو دو مہینے بیت چکے تھے۔ اور اس دوران اس نے ڈھنگ سے کسی سے بات نہیں کی تھی۔ یا تو کچن میں مصروف ہو جاتی یا پھر کام پر یا کمرے میں۔ ہمانے کئی بار اسے منانے کی کوشش کی مگر وہ یوں ظاہر کرتی جیسے کچھ ہوا ہی نہیں اور وہ ناراض ہی نہیں ہے۔ مگر اس کی سرد مہری اور خاموشی اسے ہر وقت خود سے شرمندہ رکھتی تھی۔ اس نے خود شکوہ شکایت تو کی نہیں مگر ہما سے منانے کا حق بھی جیسے چھین لیا تھا۔ ”ہما یہ والا دیکھ۔ یہ واپس کر دیتے ہیں ڈیفالٹڈ پیس لگ رہا ہے۔“ امی کے کہنے پر وہ خیالوں سے چونکی۔ پھر بے دھیانی میں دیکھنے لگی۔ یکدم جی اچاٹ ہو گیا تھا۔

دادو حسب معمول پلنگ پر نیم دراز کتاب کے مطالعے میں گم تھیں۔ بائی پاس کے بعد وہ کافی کمزور ہو گئی تھیں۔ مطالعہ کا شوق پہلے بھی تھا مگر اب ریٹ کرنے کے باعث وہ اکثر کتابوں سے ہی شغف کرتی پائی جاتیں۔

”بلایا تھا آپ نے دادو۔“ صلہ مسکراتی نظر ان پر ڈالتی بولی۔

”ہاں پتر۔ شیریں کچھ کتابیں لایا تھا۔ دیکھ لے۔“ انہوں نے ریک کی جانب اشارہ کرنے کتاب پر نظریں مرکوز کی تھیں۔ وہ ریک کی جانب بڑھ گئی جہاں زیادہ نہیں مگر خاصی تعداد میں سلیقے سے کتابیں رکھی تھیں۔ دادو زیادہ پڑھی لکھی نہیں تھی مگر پڑھنے کا شوق بہت تھا۔ خالص پنجاب گھرانے سے تعلق ہونے کے باعث ان کی اردو زیادہ تر کتابوں تک محدود تھی۔

”یہ تو سب فلسفہ اٹھا لایا ہے وہ۔“ وہ سرسری معائنہ کرتی بولی۔ تو فلسفہ بھی تو زندگی سے ہی نکلا ہے جیسے تمہاری فیری ٹیلز کہانیاں۔“ وہ گفتگو سے گویا ہوئیں۔

”فلسفہ کہانی کچھ نہیں ہوتا۔ بس تقدیر ہی سب کچھ ہوتی ہے۔ کچھ کریں نہ کریں، کوئی فرق نہیں پڑتا۔“ وہ کتاب لے کر ان کے ساتھ ہی پلنگ پر نیم دراز ہو گئی۔

”اور انسانی کوشش والے فلسفے سب بیکار..... لڑکی اتنی مایوسی والی باتیں تو نے تب بھی نہیں کی تھیں جب میڈیکل کے انٹری ٹیسٹ میں فیل ہوئی تھی۔“ وہ اپنے مخصوص انداز میں گویا ہوئیں۔ ناکامیوں کی لمبی فہرست تھی اس کے پاس ”وہ افسردگی سے سوچ کر رہ گئی۔ پھر سر جھٹکتی کتاب کھول دی۔“

”مجھے وہ چہرے پسند ہیں جو اپنی اندرونی کیفیات کا آئینہ بن جائیں۔“ انہوں نے صفحہ پلٹتے کہا۔

”یہ ڈائلاگ اس کتاب میں ہے کیا۔“ صلہ مسکراہٹ دباتے پوچھنے لگی تو دادو کے تادہ ہی نظروں سے نواز نے پر مصنوعی سنجیدگی طاری کر لی۔

”جو لوگ اپنے احساسات چھپاتے ہیں ان کے چہرے کی نرمی غائب ہو جاتی ہے اور کڑھکی آ جاتی ہے۔“ وہ ہنوز کتاب پر نظریں جمائے تھیں۔

”میں سمجھتی ہوں کہ اگر ہم اپنی اندرونی کیفیات اور احساسات چھپالیں تو بہت سی تکالیف سے بچ سکتے ہیں۔“ وہ کھوئے کھوئے سے انداز میں بولی۔ دادو نے بغور اسے دیکھا تو یکدم نارمل ہوئے گویا ہوئی۔ ”چھوڑیں ان بور باتیں کو۔ دکھائیں ”کیا پڑھ رہی ہیں آپ؟“ دادو نے کتاب بند کر کے سائیڈ ٹیبل پر رکھی اور چشمے بھی۔ ”تیری اور ہما کی کوئی لڑائی ہوئی ہے۔“ وہ اسی کی جانب متوجہ تھیں وہ گہری سانس لے کر رہ گئی۔ اس سوال سے بچنے کی غرض سے وہ گھر والوں سے بھاگتی رہتی تھی۔ ”نہیں تو۔“ اندر اٹھتے اہال کے باوجود فقط اتنا ہی کہہ پائی۔

”پتر یہ جو بال ہیں نایہ دھوپ میں سفید نہیں کیے میں نے۔ یہ شادی میں نے اس لیے نہیں کرائی تھی کہ تم تینوں منہ اڑھ کر (پھلا کر) بیٹھ جاؤ۔“ تینوں مطلب ”وہ حیران ہوئی۔ اسے تو لگتا تھا کہ وہ دونوں اس شادی سے خوش و مطمئن ہیں۔“

”ہما کو جب دیکھو گم سم رہتی ہے۔ شیریں خواہ مخواہ ہنس کر خوش ہونے کی اداکاری کرتا پھر رہا ہے۔ دونوں ڈھنگ سے بات بھی نہیں کرتے۔ پہلے میں نے سوچا کہ ہما ضدی ہے ابھی تک ناراض ہوگی۔ ست سال کم نہیں ہوندے (ہوتے)۔ پر کراچی سے آنے کے بعد جو چپ تو

نے سادھ لی ہے۔ اس سے تو یہی لگتا ہے کہ تجھے وجہ پتا ہے۔“ وہ تشویش سے بول رہی تھیں اور وہ حیران و پریشان سی بیٹھی تھی۔
”مجھے کیا پتا دادو۔ یہ ان کے آپس کا معاملہ ہے۔“ وہ ان کے ساتھ ہی دراز ہو گئی۔

”اچھا تو پھر کام میں تیرا دل کیوں نہیں لگ رہا۔ پہلے کوئی سنے نہ سنے، ساری دن کی روداد تو نے سنا بھی ہوتی تھی۔ کہ کس فنکار سے ملی کس نے تیری بستی کی یا تعریف کی تو نے کیا جواب دیا۔ یہ کراچی سے آنے کے بعد ہی سے کیوں دل اچاٹ ہوا ہے تیرا۔“ وہ آج فل بحث کے موڈ میں تھیں۔ صلہ پہلو بدل کر رہ گئی۔

”بس جی اٹھ گیا ہے دادو اس نوٹسکی سے۔ ویسے بھی کیا رکھا ہے اس فیلڈ میں۔ نہ نام نہ دولت۔ وہ بیزاری سے بولی تو دادو بھی چونک اٹھیں۔ انکاشک سہی تھا۔

”دیکھ صلہ پتر۔ مجھے نہیں پتا تم دونوں کے درمیاں وہاں کیا معاملہ ہوا ہے۔ ہمارے تیرے ساتھ جو بھی کیا وہ تیری تقدیر تھی پتر۔ وہ نہ کرتی تو کوئی اور کر دیتا۔ اور تیری تقدیر لکھنے والا ستر ماؤں سے زیادہ محبت رکھتا ہے تجھ سے وہ تیرے لیے برا تو نہیں سوچے گا نا۔ اسے رب سوہنے کی مصحلت جان کر صبر کر اور دل سے اسے تسلیم کر۔ تاکہ تیرے رویے سے ظاہر ہو۔ وہ تیری بڑی سے بڑی غلطی معاف کر سکتا ہے تو تو اس کی بندی کی چھوٹی سی بات کو درگزر نہیں کر سکتی۔ ایسا چھوٹا دل تو نہیں تھا میری صلہ پتر کا۔“ وہ اس کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرتی گویا تھیں۔ صلہ کا دل بھر آیا۔
”اس نے میرے ساتھ اچھا نہیں کیا دادو۔“ اس کا لہجہ نرم ناک ہو گیا۔

”بس لھول جا جو بھی ہوا۔ اللہ اور بہترے دے گا۔“ دادو نے تسلی دی۔ ”اور دولت شہرت تو آنی جانی چیز ہے۔ اس کا کیا رونا۔ اصل بات تو شوق کی ہے۔ مجھے بس یہ پتا ہے کہ میری پوتی کو یہ کام کرنا اچھا لگتا ہے۔ وہ خوش ہے یہ کام کر کے۔ تو لوگوں کی پرواہ مت کیا کر۔ اپنی زندگی جی۔ بعد میں تو بس وہ مشکل یاد آتی ہے کہ بھول گئے راگ، رنگ بھول گئے پھکڑی، اور تین چیزیں یاد رہیں، لون، تیل، لکڑی۔ صلہ بے ساختہ مسکرا دی۔ ان کی باتیں سن کر دل پر چھائے یا سیت کے گہرے بادل قدرے کم ہو گئے تھے۔ کچھ نہ بتا کر بھی دل کا بوجھ بہت ہلکا ہو گیا تھا۔

☆.....

سورج آگ برسا رہا تھا۔ سیٹ پر معمول کی چہل پہل تھی۔ اس نے ایک نظر چاروں طرف دوڑائی۔ وہ اسے کہیں نظر نہیں آئی مگر سامنے سے آتی زارا کو دیکھ کر اس کا حلق تک کڑوا ہو گیا۔ وہ نظر بچا کر دوسری طرف نکل کھڑا ہوا مگر وہ دیکھ چکی تھی سو فوراً اسے جالیا۔
”یہ کیا طریقہ ہے بالاج۔۔۔۔۔ تم مجھے گنور کیوں کر رہے ہو۔“ وہ اس کے سامنے کھڑی درشت لہجے میں گویا تھی۔ بالاج شمشک بے زاری چھپا پایا۔
”ایسا کچھ نہیں ہے میں مصروف ہوں۔“ وہ کاسن روم کے صوفے پر بیٹھ گیا۔ وہ اس پر جیکٹ میں شریک نہیں تھی۔ محض اس سے ملنے آئی تھی۔
”مصروف ہو۔۔۔۔۔ ہا“ اس نے نخوت سے ناک چڑھائی۔ ”تم کیا سمجھتے ہو چند لاکھ کی شاپنگ کروا کر تم نے مجھے خریدا لیا ہے کہ جب چاہا استعمال کیا جب چاہا پھینک دیا۔ مائنڈ یوسٹر شاہ میں ان لڑکیوں میں سے نہیں ہوں جنہیں تم استعمال کر کے پھینک دیتے ہو۔“ ویل۔۔۔۔۔ یہ بات خاص Debatable ہے۔“ اس نے طنز یہ ٹون اپنائی تو زارا کی تیوریوں میں اور اضافہ ہو گیا۔

”جانتی ہوں آج کل کوئی نیا شکار مل گیا ہے۔ مجھے پتا نہیں تھا کہ تمہاری چوائس اتنی گئی گزری ہے۔ کوئی ماڈل یا ایکٹر نہیں ملی تو اسٹنٹ سے ہی چکر چلانے کے چکروں میں ہو۔ یہاں موجود ایک ایک آدمی جانتا ہے کہ تم دن بھر کس طرح اسے تاڑتے رہتے ہو۔“ وہ سخت طیش میں تھی۔ غصے کی غارت سے چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔

”مانسڈ یور لینگوئج زارا۔۔۔۔۔“ وہ یکدم کھڑا ہوا تھا۔ ”پہلی بات یہ کہ میرا Taste اتنا برا بھی نہیں ہے کہ اس اسٹنٹ کو لائن ماروں اور دوسری بات نیا شکار تو مجھے مل ہی گیا ہے۔ وہی تمہاری پرانی Competitor جس نے بیوٹی کانٹسٹ میں تمہیں ہرایا تھا۔ آرزو گیلانی۔“ وہ رُکا۔ زارا کے چہرے پر سخت افسوس کے تاثرات تھے۔ ”میں بہت جلد اس سے شادی کرنے والا ہوں۔ سو بہتر ہوگا خاموشی سے اپنا راستہ ناپو۔ اور جو کچھ تم آجکل اس انڈین پروڈیوسر کو بھانے کے لیے کر رہی ہو اس کا سارا ریکارڈ ہے میرے پاس۔“ So, dont you dare to blackmail me وہ پھنکارتا وہاں سے چلا گیا۔ زارا کا سارا وجود جیسے زلزلوں کی زد میں تھا۔ یہ بات تو اس کے قریبی دوست بھی نہیں جانتے تھے۔ پھر یہ۔۔۔۔۔ اس کی ناگوں سے یکدم جان نکل گئی تھی وہ صوفے پر ہی ڈھسے سی گئی۔ ”یعنی بالاج اس کی جاسوسی کروا رہا ہے اور وہ کبھی کہ وہ سچ مچ اس میں انگریز سٹڈ ہے۔“ وہ سر تھام کر بیٹھ گئی۔ وہ زارا جو ٹیلی ویژن انڈسٹری کے ٹاپ کے اداکاروں میں گنی جاتی تھی جو شوبز کے شکاری مردوں کے لیے ٹھنڈا ٹارگٹ رہی تھی اسے کتنی آسانی سے وہ ساناو لاسونا سا مرد عام لڑکیوں کی صف میں کھڑا کر گیا تھا۔

”ہاں آرزو بولو۔“ کام سے فارغ ہو کر وہ گھر آیا ہی تھا کہ آرزو کی کال آ گئی۔ ”بس تقریباً مکمل ہی سمجھو۔ جب انسان بالکل اکیلا ہو تو اسے گھیرنے میں بہت آسانی ہوتی ہے اور پھر آدرش تو ہے ہی۔“ وہ رکا۔ آرزو نے آگے سے کچھ کہا تو وہ کھلکھلایا۔ ”لوگ خواہ مخواہ روگ پالتے ہیں۔ کوئی چیز یا انسان لا حاصل نہیں ہوتا۔ اور نہ ہی ضروری۔ ضرورت تو وہ خواہش ہوتی ہے جو اس انسان سے جڑی ہوتی ہے۔ وہ ختم تو سب چارم ختم چاہ ختم“ آرزو کے فلسفیانہ انداز میں کہنے پر اس کے چہرے پر محظوظ سی مسکراہٹ درا آئی۔ خود آرزو بھی تو اس کے شکاروں میں سے ہی تھی۔ ”بس یہ ہلکی سی خلش ختم کر لو پھر تم پورے کے پورے مزے میں ہوگی۔“ بالاج مسکراتے خدا حافظ کہتا فون رکھ دیا۔ بچوں کے کمرے میں جھانکا تو وہ دونوں سو رہے تھے۔ ایک آسودہ سی نظر ان پر ڈالتا وہ اپنے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔ ”سریہ فائل آپ کی گاڑی میں سے ملی ہے۔“ وہ یکدم مڑا ملازم مودب سا کھڑا تھا۔ ”کہاں تھی یہ فائل۔“ وہ فائل تھامتے اچنبھے سے بولا۔ صبح گاڑی صاف کرتے گلوکپارٹمنٹ سے ملی تھی۔ آپ جلدی میں تھے آپ کو دی نہیں۔“ وہ مودب سا مخاطب تھا۔ ”اچھا ٹھیک ہے جاؤ۔“ وہ اسے اشارہ کرتا اپنی اسٹڈی میں آ گیا۔ فائل کو الٹ پلٹ کر دیکھتے اسے اچانک یاد آیا تھا۔ وہ محظوظ سی مسکراہٹ لیے کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔ یہ صلہ کی فائل تھی۔ جو اس دن آدرش کی تلاش میں وہاں جانے کے بعد بارش میں بھیکتی ملی تھی۔ اس نے یونہی گاڑی میں اسے رکھ لیا تھا۔ ملجے سے سبز رنگ کی فائل اس نے اکثر صلہ کے ہاتھ میں دیکھی تھی۔ اس نے فصل کھولی۔ ذہن میں مختلف آئیڈیا کلبلا رہے تھے۔ باقی لڑکیوں کی طرح وہ گفٹس اور شاپنگ کے لالچ میں آنے والوں میں سے نہیں تھی۔ وہاں سے اس کی کہانی پر ڈرامہ بنانے پر پیسہ لگا کر ٹریپ کر سکتا تھا۔

فائل خاصی خستہ حال تھی۔ جگہ جگہ مٹی کے دھبے لگے تھے۔ کئی صفحات ابھی بھی نم تھے اور جو خشک تھے وہ اپنے اصلی سازر سے سکر کر تڑمڑ گئے تھے۔

پہلے صفحے پر بال پوائنٹ سے بڑا سا کچھ لکھا تھا۔ اس نے بغور دیکھا تو وہ ”عنایا“ تھا۔ اس نے اگلا صفحہ پلٹا تو کرداروں کے نام کی ایک فہرست تھی۔ مٹی مٹی سی تحریریں۔ ابرار، رمنا، اعجاز، عامر، بتول، عنایا جہا نگیر پرآتے وہ رکا۔ اس نام کے آگے بڑا بڑا سا زریناے خان لکھا تھا۔ وہ چونک سا گیا۔ اس نے صفحے آگے کیے تو باوجود کوشش کے بھی مسودے کے وہ شروع کا بیشتر حصہ بڑھ نہیں پایا۔ روشنائی مکمل طور پر مٹ چکی تھی شاید اس نے انک پین سے لکھا تھا۔ اس لحاظ سے آدھے سے کچھ کم مسودہ ضائع ہو چکا تھا۔ البتہ بقیہ بال پوائنٹ سے لکھے ہونے کے باعث قدرے قابل فہم تھا۔ روشنائی پھیلی ضرور تھی مگر مکمل طور پر مٹی نہیں تھی۔ وہ بے دھیانی میں سرسری سا پڑھتے صفحے پلٹنے لگا۔ کچھ ہی دیر میں وہ کہانی میں مکمل طور پر ڈوب گیا۔ اسے خبر ہی نہ ہوئی وہ کب محو ہو گیا۔ آغاز نہ پڑھنے کے باوجود مکالمات اتنے چست اور پلاٹ اتنا دلچسپ تھا کہ وہ مکمل پڑھے بغیر اٹھ ہی نہ پایا۔

☆

”اندر آسکتی ہوں۔“ ہلکی سی دستک دیتی دروازے ساتھ ٹیک لگائے کھڑی وہ صلہ ہی تھی۔ الماری بند کرتی ہما لحد بھر کو یقین ہی نہ کر پائی کہ وہ اس سے مخاطب تھی۔ وہ طائرانہ نظر کمرے پر ڈالتی اندر آ گئی۔ شیریں کا یہ کمرے پہلے امی ابو کا تھا اور گھر کا سب سے بڑا کمرہ تھا۔ ان کی شادی کے بعد امی ابا دوسرے کمرے میں شفٹ ہو گئے تھے۔ اچھے وقتوں میں رحمان صاحب نے یہ آٹھ کمرے کا گھر بڑے چاؤ سے بنوایا تھا۔ ہما کا اپنا گھر ان سے قدرے بڑا اور کشادہ تھا۔ متوسط طبقے سے تعلق ہونے کے باوجود وہ اپرٹل کلاس میں شمار ہوئے تھے جبکہ رحمان صاحب نے ساری عمر ایمانداری سے نوکری کرتے گزاری تھی۔

کمرہ نئے طریقے سے سجایا گیا تھا۔ وہ پہلی دفعہ بغور دیکھ رہی تھی۔ دو مہینے سے چھائی وہ دھند چھٹ گئی تھی۔ ریک میں لگے نفس سے ڈیکوریشن پیسز کے درمیان بڑے سے فریم میں لگی تصویر کو دیکھ کر وہ ٹھنک سی گئی۔ کسی سحر زدہ سے معمول کی طرح اس طرف بڑھی۔ ساحل سمندر پر مٹی کے گھر بناتے مصروف سے شیریں، ہما اور صلہ۔ یہ ان کی فیورٹ بچپن کی تصویر تھی جو عرصے دراز سے ان کے فوٹو البم سے غائب تھی۔

”یہ تصویر شیریں اپنے ساتھ لے گیا تھا۔“ وہیں الماری کے پاس کھڑی بت بنی ہما میں جیسے جان سی پڑ گئی۔ اس نے زیر لب مسکارتے وہ فریم اٹھایا۔

وہ تینوں میٹرک تک ایک ہی سکول میں زیر تعلیم تھے۔ اور ان تینوں کا گروپ سکول میں خاصا مشہور تھا۔ یہاں صلہ کا کسی لڑکے سے پنگا ہوتا وہیں لمبا ترنگا سا شیریں مدد کو آن موجود ہوتا۔ وہاں ہما کو کوئی لڑکی تنگ کرتی اور وہ گلا پھاڑ کر روتی تو وہی صلہ بھائی سے دیکھے نئے باکسنگ کے جوہر آزماتی اور گھر بھر کی ڈانٹ کھاتی۔ اس نے مسکراتے فریم واپس رکھا۔ ایک نظر دوسری اشیاء پر ڈالتی وہ ہما کی جانب مڑی۔

”یاد ہے اس وقت تم سکول سے resticate ہوتے ہوئے بچی تھیں۔“ ہما نے نم آنکھیں لیے بولی۔ اس تصویر کو دیکھ کر تینوں کو ایک ہی واقعہ یاد آتا تھا اور وہ تینوں خوب ہنستے تھے۔

”تم بھی خواہ مخواہ جو گوشہ بنی مار کھاتی رہتی تھیں اور جب تمہارے بدلے میں لیا کرتی تھی تو پھر گن گن کر لیتی تھی۔ پرپسل نے تو ماسٹر کرنا

ہی تھا۔“ وہ ہستے ہوئے بولی تو ہابھی مسکرا دی۔

”تو پھر یہ بہادر شیلہ اپنے بیوگو شے سی ہما کو معاف نہیں کر سکتی۔“ وہ آس بھری نظروں سے دیکھتی بولی۔ صلہ گہری سانس لے کر رہ گئی۔

”میں نے کسی کو کیا معاف کرنا ہے یار۔ میں تو خود اپنے تخیل کو بھول بھلیوں میں کھو گئی تھی۔“ وہ اس کے قریب چلی آئی۔ ”معاف کرنا اللہ کی صفات میں سے ہے۔ اپنے تخلیق کردہ کرداروں کو اس کی مخلوق پر ترجیح دے کر تکبر کی سزا پائی ہے میں نے۔ دوبارہ یہ غلطی نہیں کروں گی۔“ اس کی آواز بھرا گئی تھی۔ ہما فرط جذبات میں اس کے گلے لگ گئی۔

”ایم سوری۔ آئی ریلی ایم..... مجھے پتا وہ پروجیکٹ تمہارے لیے کیا اہمیت رکھتا تھا۔ میری بیوقوفی کی وجہ سے یہ سارا میس کر بیٹ ہوا ہے۔“

”بھول جاؤ سب کچھ۔ ماضی کا کیا رونا۔ جو بیت گیا سویت گیا۔“ اس نے نرمی سے اسے خود سے الگ کیا اور اس کے آنسو پونچھے۔

”ارے ارے رکو..... میں بھی تو ہوں۔ اتنے سالوں بعد ہمارے گینگ کاری یونین ہوا ہے۔ ڈھنگ سے ملنے تو دو۔“ شیریں جو کب سے دلہیز پر کھڑاں رہا تھا یکدم اندر آیا اور ان دونوں کو ایکس اتھ زور سے اپنے ساتھ لگا لیا۔

”شرم کر لو کچھ۔ یا امریکہ نہیں ہے۔“ ہما نے جھینپ کر اسے پیچھے دھکیلا تو صلہ بھی ہنس دی۔

”لو بھلا بیوی اور بہن کو گلے لگانا کون سا جرم ہے۔“ وہ ڈھٹائی سے بولا۔

”اچھا کیوں تنگ کر رہے ہو ہماری بھابھی کو۔“ صلہ نے اسے ڈپٹا تو وہ دونوں بھی ہنس دیں۔ ”ہماری بھابھی۔ یہاں تو خواتین گروپ بن گیا بھی۔ میرا تو اللہ ہی حافظ ہے۔ خیر میرے پاس تم لوگوں کے لیے گڈ نیوز ہے۔“

”وہ کیا۔“ دونوں یک بیک بولیں۔

”خبر یہ ہے کہ میں واپس نہیں جا رہا۔ میں نے جو چھٹیاں ایکسٹینڈ کروائی تھیں وہ بھی ختم ہو گئی ہیں مگر میں اب یہیں رہوں گا۔“ وہ دونوں کے تاثرات جاننے کو رکا۔ وہ دونوں بے یقینی سے اسے دیکھ رہی تھیں۔

”میں نے ایک دو بڑی فرم میں اپلائی کیا تھا۔ امید تو نہیں تھی مگر تیری بھابھی بڑی لگی ہیں۔ نکاح کے اگلے دن انٹرویو کال آ گئی۔ مگر ان میڈم کا سٹریل رویہ دیکھ کر واپس جانے کا سوچ رہا تھا۔ دیکھ یہ رہا اپائنٹ لیٹر۔ ایک تو تم لڑکیوں کو جب تک ثبوت نہ دکھایا جائے۔ تب تک شارپلس کی بیروئن کی طرح منہ کھولے صدیوں تک کھڑی رہتی ہو۔“ اس کے لیٹر نکالتے ہی صلہ نے جھپٹا مارا اور باہر نکل گئی۔ ”ابا کو دکھا کر آتی ہو۔“ وہ انویلیپ لیے بھاگی۔ شیریں مسکراتی ہما کی طرف مڑا۔

”جی بیگم صاحبہ..... آپ خود مبارک باد دینے آرہی ہیں یا میں آؤں آپ کی جانب۔“ وہ اس کا سجا سنورا سراپہ نظروں میں جذب کرتے پوچھ رہا تھا۔ وہ یکدم بوکھلا گئی۔

”وہ مجھے امی بلارہی تھیں۔ مجھے بالکل ہی بھول گیا تھا۔“ وہ سائیڈ سے نکلنے لگی تو اس نے رستہ روک لیا۔ ”پہلے مبارکباد۔“ اس کی نظروں میں شرارت ناچ رہی تھی۔ کیا کر رہے ہو کوئی آجائے گا۔“

”تو آجائے۔“ وہ اور قریب ہوا۔

”امی آپ.....“ ہما یکدم چونک کر سیدھی ہوئی تھی۔ شیریں ہنر بڑا کر مڑا تھا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ چوکھٹ بالکل خالی تھی۔ اب وہاں سے ہما جاتی نظر آرہی تھی۔ ”ہما کی بچی..... بڑی ایکثر ہوگئی ہو۔ دیکھ لوں گا تمہیں۔“ اس نے منہ پر ہاتھ پھیرتے دھمکی دی۔ ہما اسے منہ چڑاتی وہاں سے بھاگی تھی۔

.....☆.....

”جاڑا آیا، جاڑا آیا.....“ باہر لاؤنج میں کشف اور ارنیل اونچی آواز میں ٹی وی پر لگے کمرشل سنگ موسیقی کے جوہر آزمایا رہی تھیں۔ سخت سردی کے دن تھے۔ شام ہو رہی تھی اور خشک سردی کی شدت بڑھتی جا رہی تھی۔ اندر کمرے میں دادو لیٹی تھیں اور ان کے ساتھ مونگ پھلی کھاتی ہما ان کے کبل میں گھسی بیٹھی تھی۔ کارپٹ پر بیٹر کے قریب بیٹھی صلہ کے گال سرخ پڑ گئے تھے کہ کمرے کی اکلوتی کرسی پر امی براجمان تھیں اور کسی سوٹ کی مرمت میں مصروف عمل تھیں۔ صلہ دادو کے بیڈ سے لگی بیٹھی تھی اور بیٹر کا رخ دادو کے پاؤں کی جانب تھا۔

”اف..... یہ بیٹر کا منہ دوسری طرف کر دوں؟“ اس نے بالآخر چڑ کر کہا تھا۔ ہما جو دو عدد داؤنی سویٹر پر کبل اوڑھے بیٹھی تھی یکدم چلائی۔ ”بالکل نہیں تم کمرے سے باہر چلی جاؤ۔“

”میں کیوں باہر جاؤں..... اس موئے بیٹر کی تپش سے میرے منہ سے سینک نکلتے لگتی ہے۔“ وہ ٹھنڈے ہاتھوں سے گال رگڑتی بولی۔ ڈسٹ الرجی کے باعث اس کی سکن بہت حساس تھی۔ تیز دھوپ یا سردی میں بیٹر کی تپش سے گال دھک اٹھتے تھے۔ جیسے آگ نکل رہی ہو اور ہاتھ رخ ہو جاتے تھے ایسا اور روا یکسا ٹمنٹ میں بھی ہو جاتا تھا۔

”تم تو ہوئی نمونہ..... بلکہ لاعلاج نمونہ۔“ ہما کے کہنے پر وہ منہ پھلا کر بیٹھ گئی۔

”صلہ بیٹا جاؤ ذرا چائے لا دو مجھے۔“ امی نے کہا تو صلہ حیران ہوئی۔

”ابھی تو پی ہے آپ نے چائے۔“ اس نے پاس پڑے چائے کے کپ کی طرف اشارہ کیا۔ وہ مزید برہم ہوئیں۔

”بحث نہیں کرو باہر جاؤ۔“ صلہ مشکوک ہوئی۔

”یہ بہانے سے مجھے باہر کیوں بھیجا جا رہا ہے۔ کونسی خفیہ بات کرنی ہے۔“ وہ کھڑی ہوتے شرارت سے گویا ہوئی۔ امی نے جواباً غصیلی نظر ڈالی تو وہ منہ بنا تی چلی گئی۔

اس کے باہر جاتے ہی وہ دادو کی طرف مڑیں۔ جو بیٹھی اونگھ رہی تھیں۔

”آج بھابھی کا فون آیا تھا۔ جواب مانگ رہی ہیں۔ خواہ مخواہ شیریں نے وقت لیا سوچنے کا۔ میں تو بس اس کے ابا کو آج حتمی کہہ دوں گی

کہ ہاں کر دیں۔“

دادو نے قدرے تاسف سے انہیں دیکھا۔ جوان کی پوتی کے بیاہ کے معاملے میں حتمی فیصلہ ان سے پوچھ نہیں بلکہ بتا رہی تھیں۔

”کیا بات ہوئی بھلا۔ چلو مجھ سے پوچھنا تو تمہیں گوارا نہ ہوا کم از کم اس غریب سے تو پوچھ لو جسے شادی کے نام پر قربان کرنے جا رہی ہو۔“ وہ سخت برامان گئیں۔ عالیہ بیگم ساس کا مزاج دیکھتی یکدم سیدھی ہوئیں۔

”ایسی بات نہیں ہے اماں۔ آپ سے رحمان نے پوچھا تو تھا جب بات شروع ہوئی تھی اور پھر صلہ سے پہلے میں پوچھ کر پچھتائی۔ اس دفعہ پھر انکار کر دے گی وہ۔ مگر میں اس بار نہیں پوچھنے والی۔ آپ کے لاڈ کی وجہ سے وہ پہلے ہی بہت بگڑی ہوئی ہے۔“ وہ دونوں انداز بولیں۔ ہا چپکے سے کمرے سے نکلی اور دروازے کی طرف بڑھی۔ ”کمال کرتی ہو بہو تم بھی۔۔۔۔۔ اس سے تو اچھا ہے لڑکی کی آنکھیں پھوڑ دو۔ اور چپ کے سے رخصت کر دو۔“

”ایسے تو نہ کہیں اماں۔ عذیر میں کیا خرابی ہے۔ ماشاء اللہ پڑھا لکھا ہے، خوش شکل ہے، باپ کے کاروبار میں ہاتھ بٹاتا ہے اور کیا چاہیے۔“ انہوں نے تایا ابا کے بیٹے کی تعریف کی۔ دادو ناک بھوں چڑھا کر رہ گئیں۔

”خرابی یہ ہے بہو کہ وہ صلہ کو نہیں پسند۔ اور یہ وجہ بہت کافی ہے انکار کرنے کو۔“ وہ بے چک لہجے میں بولیں۔ عالیہ بیگم سخت نالاں ہوئیں۔

”اماں آپ تو ہمیشہ۔۔۔۔۔“ ہما ان کو بحث کرتا چھوڑ کر کچن میں چلی آئی۔ جہاں صلہ چائے بنا رہی تھی۔

”کیا کر رہی ہو۔“ وہ پر جوش سی بولی۔ لڈیاں ڈال رہی ہوں۔“ صلہ تنک کر بولی تو وہ ہنس دی۔ ”پیوگی چائے۔ اس نے چائے لگ میں ڈالتے پوچھا تو اس نے نفی میں سر ہلایا۔“ میں تو کھانا کھا کر پیوں گی۔ مجازی خدا تشریف لائیں تو کھانا نصیب ہو۔“ وہ دونوں ہاتھ آپس میں رگڑتی پھونک مار کر انہیں گرم کر رہی تھی۔ صلہ شیر کی پرانی جیکٹ گھر میں پہنتی تھی۔ پیراشوٹ ہونے کے باعث وہ خاصی گرم تھی۔ جبکہ ہما دو عدد موٹے اونٹنی سوٹر پہنتی تھی اور کانوں کے گرد شال لپیٹ رکھی تھی۔ وہ بے اختیار مسکرا دی۔ ”بالکل برفانی بھالو لگ رہی ہو۔“ وہ اسے چھیڑتی کپ لیے ہما کے کمرے کی جانب چل دی۔

”آنٹی نے تم سے پانی منگوایا تھا اور تم خود چائے بنا کر بیٹھ گئی ہو۔“ ہما نے کمرے میں آتے اسے لتاڑا۔ ”بھئی ان کا آج پھر سے میری شکایتیں لگانے کا موڈ تھا سو وہاں سے بھگانے کا بہانہ تھا۔“ وہ مزے سے ٹانگیں پسار کر بیڈ پر نیم دراز ہو گئی۔

”تو تمہیں مسئلہ کیا ہے عذیر کے ساتھ۔ راحیلہ بتا رہی تھی کہ جب سے دادو کی بیماری کے وقت وہ لاہور سے ہو کر گیا ہے تب سے تمہارے سنجیدہ اور انسانوں والی حرکات دیکھ کر لٹو ہو گیا ہے تب سے شادی کی ضد لیے بیٹھا ہے۔“ ہما آج اسکی کلاس لینے کے موڈ میں تھی۔ صلہ اس کی تیاری دیکھ کر مسکرا دی۔

”بھئی عذیر کے ساتھ مسئلہ یہ ہے کہ اس کے ساتھ میرا کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے۔ کوئی لڑائی کوئی پھنڈا نہیں ہے۔ کتنی بورنگ لائف ہوگی اس کیس اتھ۔“ وہ مسکراہٹ دبائے بولی۔

”تو پھر اس بالاج سے شادی کر لو۔ پھڈے تو اسی کے ساتھ تھے تمہارے۔“ وہ تنک کر بولی۔

”آئیڈیا برا نہیں ہے ویسے۔ وہ مصنوعی سنجیدگی طاری کرتی بولی پھر ہما کے گھورنے پر وہ چپ کر کے چائے کی چسکیاں لینے لگی۔

”کہیں تم جمال یوسف کی وجہ سے تو انکار نہیں کر رہیں۔“ وہ محتاط سے انداز میں پوچھ رہی تھیں۔ صلہ نے ایک سپاٹ سی نظر اس پر ڈالی۔

پھر آہستگی سے گویا ہوئی۔

”آئیڈیل، حقیقت میں کموٹی وجود نہیں رکھتے ہمارا اگر وجود رکھتے بھی ہوں تو لا حاصل ہوتے ہیں اور یہ بات میں پہلے بھی نہیں بھولی تھی۔“ وہ چائے سے نکلتی بھاپ کو دیکھ رہی تھی۔ ہما دل مسوس کر رہ گئی۔

”تمہارا زرینہ سے کوئی رابطہ ہوا؟ آئی مین سال ہونے والا ہے اب تو۔“ وہ اس کا موڈ جانچتے بولی۔ ”میرا ان سے کوئی رابطہ نہیں ہے اور نہ انہوں نے کیا۔ ویسے بھی وہ دوسری بار اعتبار کرنے والوں میں سے نہیں ہیں۔“ اس کا لہجہ باہر کی سردی سے جیسا ٹھنڈا تھا۔ ہما متحیر سی رہ گئی۔ وہ پہلے تو اتنی بے حس کبھی نہیں تھی۔

”تم کہو تو میں بات کروں ان سے۔ میں انہیں سب کچھ۔۔۔۔۔“

”نہیں۔“ صلہ کے انداز میں اتنی سختی تھی کہ باوجود چاہنے کے وہ بات پوری نہ کر پائی۔

”پرسوں ندیا ملی تھی مجھے۔“ وہ رکی۔ صلہ لا تعلق سے چائے پی رہی تھی۔ ”بتا رہی تھی کہ کشمیر میں کسی سیاسی مسئلے کے باعث ان کی فلم رک گئی ہے۔ سندھ کے گوٹھ صادق آباد کی سائیڈ کا کام وہ مکمل کر چکی ہیں۔ پہلے بھی کشمیر میں کوئی پر اہلم ہوئی تھی۔ مگر پچھلے دو مہینے سے پھر کام رکا ہوا ہے۔“ اپنی طرف سے اس نے بڑی خبر دیت ہی۔ صلگ رکھتی الماری کی جانب بڑھ گئی۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ ”تیار ی پوری ہو گئی تم لوگوں کی، کچھ رہ تو نہیں گیا۔“ وہ الماری کھولے جائزہ لے رہی تھی۔ ہما بے بسی سے اسے دیکھ کر رہ گئی۔ شیری کا ٹرانسفر کراچی ہو گیا تھا۔ اور دو دن میں انہیں ہیڈ آفس رپورٹ کرنا تھا۔ وہ سر جھکتی الماری کی جانب بڑھ گئی کہ ابھی بہت کام باقی تھا۔ اگلی صبح شیری اور ابا کو ناشتہ دیتی ہما جھٹکی۔

”آئی۔ صلہ کدھر گئی۔“ توے پر توس سینکے عالیہ بیگم ذرا کی مزیں۔ ”ابھی تو اٹھی تھی۔ دیکھو پھر جا کر لیٹ نہ گئی ہو۔“ وہ مصروف سے انداز میں کہتیں انڈا پھینٹنے لگیں۔

وہ بیڑھیاں چڑھتی اوپر چلی آئی۔ دروازہ چوٹ کھلا تھا۔ کمرے میں ملجلی روشنی تھی۔ اس نے لائٹ جلائی تو آنکھوں پر بازو لپیٹے صلہ کی آنکھیں چند یا سی گئیں۔ وہ ہنوز لیٹی رہی ہانے آگے بڑھ کر کبل کھینچ لیا۔ ”یہ کونسا وقت ہے سونے کا۔“ وہ بازو ہٹا کر خاموش سی نظر اس پر ڈالتی آہستگی سے اٹھ بیٹھی۔ آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔

”کیا ہو گیا ہے تمہیں صلہ اتنی عجیب ہوتی جا رہی ہو تم۔“ وہ کبل تہ کرتے بول رہی تھی۔ بالوں کا ڈھیلا سا جوڑا بناتی صلہ کی متورم آنکھیں دیکھ کر وہ چوکی۔

”کیا ہوا۔ تم روئی ہو؟“ وہ متحیر سی اس کے پاس چلی آئی۔ جو ابا ایک خاموش سی نظر اس پر ڈالتی صلہ نے صبح کا گول مول کیا اخبار اس کی جانب بڑھا دیا۔ وہ کچھ الجھتی اخبار الٹ پلٹ کر دیکھنے لگی۔ وہی روز کی گھنٹی پٹی سیاسی خبریں۔ دوسرے صفحے پر دیکھتے وہ یکدم ٹھکی۔ چھوٹی سی شہ سرخی پر نظر پڑتے وہ دنگ سی رہ گئی۔

”80 کی دہائی کے معروف اداکار جمال یوسف نے ابرسدھوانامی امریکی نژاد پارسی لڑکی سے شادی کر لی۔ لڑکی کی عمر 20 سال ہے

نکاح کی تقریب انتہائی شان و شوکت کے ساتھ پیرس میں وقوع پذیر ہوئی۔“

آگے مزید تفصیلات پڑھنے کی اس کی ہمت نہیں ہوئی۔ اشتعال کی بھرپور لہر اس کے وجود میں دوڑ گئی۔ اس نے غصے میں اخبار دور پھینکا۔
صلہ گھٹنوں میں سر دیے بیٹھی تھی۔ وہ چند لمحے کچھ بول ہی نہ پائی۔ تسلی کا ہر لفظ چھوٹا لگ رہا تھا۔

”مجھے علم ہے کہ یہ تمہارے لیے بہت بڑی بات ہے۔ مگر جانتی ہو۔ مجھے اس وقت کیا لگ رہا ہے۔“ وہ رُکی صلہ ہنوز اسی پوزیشن میں ساکت و ساکن بیٹھی تھی۔

”مجھے لگتا ہے کہ یہ قدرت کی طرف سے اشارہ ہے کہ اب تم سب پچھلی باتیں بھلا کر نئے سرے سے زندگی شروع کرو۔“ وہ کہہ کر دروازے کی جانب چل دی۔ پھر یکدم رُکی۔ ”اور ہاں کل تم ہمارے ساتھ کراچی جا رہی ہو۔ اس حال میں تمہیں میں یہاں قطعاً نہیں چھوڑنے والی۔“ پھر وہ باہر چلی گئی۔ اس وقت اسے اکیلے چھوڑ دینا بہتر تھا۔ باہر جاتے اسے پوری امید تھی کہ اب صلہ کوئی حتمی فیصلہ کر کے ہی اٹھے گی۔

.....☆.....

گاڑی پُر ہجوم سڑک پر سبک رفتاری سے بڑھ رہی تھی۔ ڈرائیونگ سیٹ پر براجمان عذیب بیک ویو مرر سے گاہے گاہے پیچھے لاتعلق سی بیٹھی صلہ پر نظر ڈال رہا تھا۔ فرنٹ سیٹ پر شیریں اور صلہ کے ساتھ بیل چباتی خوش باش ہما بیٹھی تھی۔

گاڑی سمندر کنارے سے گزر رہی تھی۔ صلہ نے بے اختیار نظریں چرائی تھیں۔ سمندر سے اسے عشق تھا مگر اس کی فائل اب تک کسی ندی نالے سے گزرتی رُق در ورق بکھری پڑی ہوگی۔ اسی سمندر میں۔ فائل کا سوچتے دل میں ٹیس سی اٹھتی تھیں۔ وہ اب کبھی کراچی نہ آنے کا عہد کر چکی تھی۔ مگر وہ دونوں اسے کسی طور لاہور چھوڑنے پر راضی نہ تھے۔ جانے ہمارے شیریں کو کیا کہا تھا جو وہ اتنی آسانی سے مان گیا تھا۔ اور عذری کی وجہ سے امی بھی مصر تھیں کہ وہاں جانے سے شاید اس کا فیصلہ بدل جائے۔ لیکن وہ سب یہ نہیں جانتے تھے کہ یہاں سے جڑی خوشگوار اور تلخ یادیں اس کے قدم جکڑ لیتی تھیں اور جو بار بار وہ پیچھے دیکھے وہ آگے کیسے بڑھ سکتا ہے۔

2 سال جس مسودے پر اس نے بے حد محبت اور محنت سے کام کیا وہ اچانک اس قدر خاموشی سے دنیا سے مٹ گیا اور کسی کو نہ خبر ہوئی اور نہ فرق پڑا۔ یہاں تک کہ خود وہ جو اس مسودے کو اپنا ماسٹر پیس سمجھتی رہی اور اس کے بغیر زندگی کا تصور محال تھا، اب بھی زندہ تھی اور زندگی میں کوئی خاص فرق نہیں پڑا۔ بس اتنا ہوا تھا کہ وہ لفظوں سے محروم ہو گئی تھی۔ گہری سانس لینے اس نے آنکھیں موند لیں۔ آج بڑے دن بعد وہ کہانی اور اس سے جڑے کردار یاد آنے لگے تھے۔ اگرچہ سب کردار افسانوی تھے مگر منابِ تول اور فاروق بالترتیب صلہ، ہما اور شیریں سے ملتے جلتے لوگ تھے۔ اور وہ مرکزی کردار بھی نہیں تھے۔ وہ اپنے لکھے ان کرداروں کو حقیقت میں بے ہما شیریں اور صلہ پر محمول کر بیٹھی تھی۔ بتول، رمنا کی دوست نہ ہوتے ہوئے بھی ہر مشکل میں اس کے ساتھ تھی جبکہ ہمارے بہترین دوست ہوتے ہوئے اسے وہاں دغا دیا تھا جہاں اس نے سوچا تک نہ تھا۔ مرکزی کردار عنایا جہانگیر، زرینہ سے یکسر مختلف خصوصیات اور خامیوں کا حاصل تھا۔ ان سے اس اتفاقہ ملاقات کے بعد جانے کیوں اسے عنایا کی جھلک ان میں دکھائی دینے لگی تھی۔ وہ عنایا جو رمنا کی کچھ نہیں لگتی تھیں۔ ایک اتفاقہ ملاقات میں جو حقیقت کی اتفاقہ ملاقات سے مختلف تھی، ان دونوں کو خون کے رشتے سے

زیادہ مضبوط رشتے میں باندھ دیتی ہے۔ کہانی عنایا کے گرد گھومتی ہے مگر اس وقت اسے رمنہ کے گرد گھومتی محسوس ہو رہی تھی۔ عنایا کے کردار سے اسے محبت محض اس وجہ سے تھی کہ وہ اسے تحفے کے طور پر ودیعت ہوا تھا۔ کہانی لکھتے یا شروع کرتے وقت ایسا کوئی کردار اس کے ذہن میں نہیں تھا۔ اس اتفاق ملاقات میں وہ کردار اچانک جیسے اس کے قلم میں آسایا اور خود کو لکھواتا چلا گیا۔ اپنے آغاز سے لے کر انجام تک اس کردار نے جیسے خود اپنا آپ اس کہانی میں منوایا۔ اور عام سی کہانی اس کے لیے بے حد خاص ہو گئی اور اسی دورانِ زرینہ سے ملاقات نے گویا اس کی تخیلاتی دنیا کو چار چاند لگا دیے تھے۔ لیکن پھر ہمارا زرینہ کی اچانک بد اعتمادی اس کے لیے شدید جھٹکا ثابت ہوئی۔ اب اگر ذہن میں آئیڈیاز بھی کلبلائیں تو وہ گھنٹوں خالی صفحات کو گھورتی رہتی مگر ایک لفظ ڈھنگ سے نہ لکھ پاتی۔

گاڑی کو ہلکا سا جھٹکا لگا تو اس کی محبت ٹوٹ گئی۔ شاید کوئی سپیڈ بریکر تھا۔ باہر منظر بدل گیا تھا۔ اب وہ کسی پارک کی ذیلی سڑک سے گزر رہے تھے۔ وہ بے بسی سے سوچتی رہ گئی۔ کس قدر بے یقینی تھی اس وقت جب اس نے زرینہ کو انکی گاڑی کی طرف آتے دیکھا تھا۔ اس نے زبردستی دھیان ہٹانے کو ہما کا فون اٹھایا اور گیم کھیلنے لگی۔ وہ الگ بات تھی کہ اس کا دھیان پارک کی خوشنما پھولوں میں الجھ چکا تھا۔



درد اتنا ہے کہ ہر گ میں ہے محشر برپا
سکون اتنا کہ مر جانے کو جی چاہتا ہے

جیکٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے وہ سست روی سے قدم اٹھا رہا تھا۔ سردی کے باوجود کافی لوگ ساحل سمندر پر چھٹی منانے آئے تھے۔ کہ شاید کراچی میں اس سے سستا شغل کوئی بچا نہیں تھا۔ اسے مستقل لاہور سے کراچی شفٹ ہوئے چھ ماہ ہو چکے تھے۔ اس فائل کو پڑھنا آئینہ دیکھنے کے برابر تھا۔ اور آئینے میں اگر اپنا عکس بھیا تک لگے تو کون برداشت کرتا ہے۔ وہ بھی نظریں چرا کر بھاگ آیا تھا۔ خود کو مطلق العنان سمجھنے والا، حالات کو ذمے دار ٹھہرانے والا یکدم خود کو مجرم محسوس کرنے لگا تھا۔ زندگی میں بعض لمحات ایسے ہوتے ہیں جن کی قید میں ہمارا آنے والا ہر فیصلہ ان کا پابند ہو جاتا ہے۔ وہ بھی اسی لمحے کی قید میں آ گیا تھا۔ ابرار کا کردار اس سے ملتا جلتا تھا اور اس کا انجام پڑھ کر اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے۔ جسے خاندان کے بڑے بڑے پیر نہ سدھار سکے اسے ایک عام سی کہانی نے چاروں شانے چت کر دیا تھا۔ یہ شکست وہ اب تک تسلیم نہ کر پایا تھا۔ اپنی سوچوں میں گم چلتے اس کے قدم یکدم رکے تھے۔ اس کی نظروں میں استعجاب در آیا۔ پھر سر جھٹکتے وہ آگے بڑھنے لگا مگر اس بیخ سے آگے ایک قدم نہ بڑھا سکا۔ وہ واقعی وہی تھی، ابرار اور رمنہ کا کردار لکھنے والی۔ اس لڑکی کو ان چھ ماہ میں اس نے جی بھر کوسا اور جی بھر کر سراہا تھا۔ ہر متضاد کیفیت میں اسے وہ یاد آئی تھی۔ وہ اب جیسے تھک سا چکا تھا۔ بے یقینی، اضطراب، بے چینی ہر قسم کی کیفیت سے دل پر طاری ہو رہی تھی۔ وہ ہمیشہ کی طرح اس کی جانب پشت کیے اپنی سوچوں میں گم تھی۔ ”صلہ.....“ اس نے گھبرا کر پکارا تھا۔ اس کی آواز اتنی مدھم تھی کہ صلہ محض وہم کے گمان میں مڑی تھی۔ پھر چونک سی گئی۔ اس کی نظروں میں بے اختیار ناگواری در آئی تھی۔ بالاج کو اس کی ناگواری دیکھتے ہی اس کے حقیقتاً ہونے کی تسلی سی ہوئی۔ وہ کسی سحر زدہ معمول کی طرح اس کے ساتھ بیٹھ پر آ بیٹھا۔ اور حسب توقع بیٹھ کے دوسرے سرے سے جا لگی۔ وہ بے اختیار مسکرا دیا۔ اس کے گریز کو اس نے ہمیشہ

اپنی ہنک گروانا تھا۔ مگر آج وہ سمجھ گیا تھا کہ وہ محض اس سے خوف زدہ تھی۔ اور ہونا بھی چاہیے تھا۔ سیاہ لالنگ قمیض پر لالنگ سویٹر پہنے دوپٹہ ایک کندھے پر یونہی جھول رہا تھا۔ خلاف معمول آدھے بال کچر میں مقید تھے۔ ستوران ناک سرخ ہو رہی تھی۔ بالاج کی گہری نظریں خود پر جمی دیکھ کر وہ سخت کبیدہ خاطر ہوئی۔ اور ادھر ادھر ہما اور شیریں کی تلاش میں دوڑائی۔ قریب وہ کہیں بھی دکھائی نہیں دیے۔ وہ بد مزہ سی ہوئی۔ اب اس شخص کی طنزیہ اور تمسخر اڑاتی باتیں برداشت کرنے کا حوصلہ اس میں نہ تھا۔ جی کڑا کرتے وہ جیسے خود کو اس کے طنزیہ باتوں کے جواب تیار کر رہی تھی۔ عرصے سے غصہ اتارنے کو کوئی ملا بھی تو نہیں تھا۔

”جمال یوسف کاسن کرافسوس ہوا۔“ اس کے آہستگی سے کہنے پر وہ دنگ ہی تو رہ گئی تھی۔ وہ اب سامنے دیکھ رہا تھا۔ سو وہ فیصلہ نہ کر پائی کہ وہ طنز کر رہا ہے یا سنجیدہ ہے۔

”آج مذاق اڑانے کو کوئی نہیں ملا آپ کو۔“ وہ استہزائیہ ہنسی۔

”مجھے واقعی افسوس ہے۔ تمہارے لیے نہیں بلکہ اس شخص کے لیے جس نے ہیرا چھوڑ کر پتھروں سے دامن بھر لیا۔“ وہ سنجیدگی سے کہتا سگریٹ سلگانے لگا۔ صلہ اندر ہی اندر جھنجھلائی۔ پھر وہی خوبصورت لفظوں کا مایا جال۔

سگریٹ کا گہرا کش لیتا بالاج علی شاہ آج بہت تھکا تھکا سا لگ رہا تھا۔ آنکھوں کے گرد حلقے، رف ساحلیہ، بڑی محنت سے سلیٹ کیے بال یونہی ماتھے پر بکھرے تھے۔ احساسِ تفاخر سے لبریز اور دوسروں کا تمسخر اڑاتی نظروں میں عجیب ویرانی سی تھی۔ اس کی سیاہ پرکشش آنکھیں جو ہمیشہ بولتی محسوس ہوتی تھی آج بہت خاموش سی تھیں۔ اس سادہ سے بھورے شلوار سوٹ پر جیکٹ پہنے وہ پہلی دفعہ معصوم قدرے مظلوم سا لگ رہا تھا۔ ”کیا دیکھ رہی ہو۔“ اس نے اس کی محویت بھانپتے دلچسپی سے پوچھا تھا کہ ایک بار سہی اس نے جی بھر کر دیکھا تو۔ وہ خفیف سی ہو کر رخ پھیر گئی۔ ”دیکھ رہی ہوں کہ آج وڈیرہ بالاج علی شاہ کی شاید طبیعت خراب ہے۔“ وہ دھیرے سے ہنس دیا۔

”اس وڈیرہ سٹم سے نفرت تھی۔ تبھی تو بیوی بچوں سمیت وہاں سے شہر چلا آیا۔ سب نے اسے بیوقوفی قرار دیا کہ کون اپنی سلطنت چھوڑ کر جاتا ہے۔ مگر مجھے عام گھریلو زندگی گزارنی تھی۔ ایک گمنام سی زندگی۔ مگر وقت کے ظالم تھپیڑوں نے کہاں لاکھڑا کیا ہے۔“ وہ پیچھے ہو کر بیٹھا۔ آتے جاتے لوگ عجیب سی نظروں سے انہیں دیکھ رہے تھے۔

”اس انسانی ریلے میں ایک بھی اپنا نہیں ہے۔ دیکھو زرا آج میں چہرے پر چڑھایا خوبصورت نقاب گھر چھوڑ آیا ہو تو کوئی پہچان تک نہیں رہا۔“ وہ جیسے خود پر ہنسا تھا۔ اس کی ہر حرکت سے اضطراب نمایاں تھا۔

”دنیا کے اس اسٹیج پر سب کا یہی المیہ ہے۔ ہر کوئی اپنی شناخت ڈھونڈنے نکلا ہے کوئی صنم، کوئی خدا ڈھونڈنے نکلا ہے۔ مگر عشق کا رتبہ تو عشق ہی جانے یا پھر وہ خدا جس نے اپنے محبوب کے عشق میں یہ میلا سجا یا ہے۔ ہماری ادنیٰ کوششیں، ہماری ناقص عباتیں بھلا کہاں اس لائق ہیں کہ خالی صنم کو ہی پالیں۔ خدا کو پانا تو دور کی بات ہے۔ جسے چاہا معراج کر دیا، جسے نہ چاہا لاکھ صحرا، جنگل کی خاک چھانی، اسے مٹی میں رول دیا۔ سب بات نصیب کی ہی ہے۔“ وہ سامنے دیکھتی جیسے خود کلامی کر رہی تھی۔ بالاج کو جھٹکا سا لگا تھا۔ عنایا جیسی انسانی کوشش کی مثال سے بھرپور کہانی لکھنے

والی حد درجہ قنوطیت کا شکار لگ رہی تھی۔

”تم محض تصویر کا ایک رخ دیکھ رہی ہو کیونکہ ہاتھ چھوڑ کر بیٹھ جانا بہت آسان ہے۔ لیکن تم بھول رہی ہو انسان کا مقام اس کی جدوجہد طے کرتی ہے۔ اس کا نصیب معراج ہو یا مٹی میں رلنا اس سے قطع نظر وہ جی جان سے محنت کرتا ہے۔ انسان جیسی باغی مخلوق کے قدموں میں اگر تقدیر نام کی بیڑیاں نہ ہوں تو ہر کوئی فرعون بن کر بیٹھ جائے۔“ پر سوچ انداز میں کہتا وہ کوئی الگ ہی بالاج لگ رہا تھا۔ وہ اسے دیکھ کر رہ گئی۔ شاید وہ مایوسی میں حد سے بڑھ رہی تھی۔ اس نے بے اختیار جھرجھری سی لی۔ چند لمحے یونہی خاموشی سے گزر گئے۔ وہ سگریٹ کے دھوئیں میں جانے کیا کیا اڑاتا رہا۔

”آدرش کیسا ہے۔“ وہ بے اختیار پوچھ بیٹھی۔ یوں لگتا تھا جیسے اس سے ملے صدیاں بیت گئی ہوں۔

”ٹھیک ہے۔ تم سے ملنے کی اکثر ضد کرتا ہے مگر مجھے اسے بہلانا آ گیا ہے۔ جیسے خود کو بہلا لیا ہے۔“ وہ توقف کو رکھا۔ ”کیونکہ میں نہیں چاہتا کہ وہ ابھ کبھی بھی تم سے ملے۔“ پھر اس کو دیکھ کر پوچھنے لگا۔ ”پوچھو گی نہیں کہ کیوں۔“ صلہ ہنس دی۔

”اس میں پوچھنے والی کوئی بات ہے۔ آئی نو یو ہیٹ ی۔ ایز ایم ناٹ یور ٹائپ۔ آپ کے بچوں کو بگاڑ دوں گی وغیرہ وغیرہ۔“ ٹانگ پر ٹانگ رکھے وہ اطمینان سے بولی تھی۔ وہ عجیب سے انداز میں ہنس دیا۔ ایک عرصہ خود کو یہی کہتا تسلی دیتا رہا تھا۔

”میں نے اسے رکا کیونکہ میں ابرار نہیں بننا چاہتا صلہ۔“ اس کی گہیر آواز گونجی تھی۔ صلہ دم بخود رہ گئی۔ چند لمحے وہ کچھ بول ہی نہ پائی۔

”فائل میرے پاس ہے۔ میں نے وہاں سے اٹھائی تھی۔ شروع کا کچھ حصہ ضائع ہوا ہے مگر باقی تھوڑی تگ و دو کے بعد قدرے قابل فہم ہے۔“ اس کی بے یقینی بھانپتے اس نے خود ہی بتایا۔ تو صلہ کا جیسے سکتہ ٹوٹا۔

”آپ ابرار کیسے ہو سکتے ہیں۔ وہ عام شکل و صورت کا کا مپلیکس زدہ آدمی تھا جو۔“ اس کے بے تاثر لہجے میں کہے جملے کو اس نے بیچ میں کاٹ دیا۔

”جو ساری دنیا سے اپنی بد صورتی کا بدلہ لینے نکلا تھا۔ جس کا مقصد خوبصورت لوگوں کو نیچا دکھانا تھا۔ میں ابرار ہی ہوں صلہ۔“ وہ تھکن زدہ لہجے میں بولا تھا۔ اس کی نظروں میں ڈھیروں حیرت در آئی۔ اس نے تو کبھی بالاج اور ابرار کے درمیان مشترک قدروں پر غور ہی نہیں کیا۔

”سارا بچپن اپنے خوبصورت کزنز اور بھائیوں کے درمیان Ugly duckling کی طرح منہ چھپاتے گزر گیا۔ کالج سے فارغ ہو ہوا تھا کہ ہادیہ جیسی خوبصورت کزن سے جمیری شادی کروادی گئی۔ میرے تو قدم زمین پر نکلتے ہی نہیں تھے۔ اس کی خاطر اپنی سلطنت چھوڑ کر لاہور آ گیا کہ اسے وہاں کے گھٹن زدہ ماحول میں رہنے سے چڑھتی۔ میری وارڈ روم میں ایک بھی سفید شرٹ یا سوٹ اس نے نہیں چھوڑا۔ کیونکہ سفید رنگ میں میری سانولی رنگت اور گہری لگنے لگتی تھی۔ اسے میرے رنگ سے میری ہر عادت سے اختلاف تھا۔ میں تو پہلے ہی احساس کمتری کا مارا تھا۔

رہی سہی کسر اس کی بے وفائی نے پوریکردی۔ اب تو شاید زندگی بھر عورت پر بھروسہ نہ کر پاؤں۔“ وہ ایک اور سگریٹ سلگاتے خاموش ہو گیا۔ اذیت پھر سے بڑھ گئی تھی۔ صلہ کو حقیقتاً دکھ ہوا تھا خود اس نے ان کی شادی کی تصویر دیکھ کر جو کمٹ پاس کیا تھا اس پر از حد شرمندگی محسوس ہو رہی تھی۔ باقی لوگوں کی طرح وہ بھی محض بیرونی خوبصورتی سے بہننے والوں میں سے تھی۔

93

”لیکن یہ سب آپ مجھے کیوں بتا رہے ہیں۔“ وہ شرمندگی پر قابو پاتی بولی۔

”تم نہیں جانتیں؟“ وہ اسے بغور دیکھتا بولا۔ اس نے بے ساختہ نظریں چرائیں۔ رمنا ابرار دو قالب اور ایک جان مثل تھے۔ ”میں نہیں چاہتا کہ میرا انجام ابرار جیسا ہو اور میرے گناہوں کی سزا میری معصوم بیٹی کو ملے۔“ وہ ٹھکست خوردہ لہجے میں بولا تھا۔ بے پناہ محبت کے باوجود ابرار کبھی رمنا کو سکھ نہ دے پایا تھا۔ اس کے گناہوں کا خمیازہ اس کی بیٹی نے بھگتا۔ ”یہی تو مسئلہ ہے ہم لوگوں کا۔ انسان کی لکھی تحریر کو اپنے آپ سے Relate کرنے لگتے ہیں۔ جبکہ ہماری کہانی لکھنے والا تو خدا ہے اور صرف وہ جانتا ہے کہ ہمارا انجام کیا ہوگا۔ اپنے تخیل میں گم ہوتے میں یہ بھول گئی تھی کہ افسانوی کردار، حقیقت سے قریب تو ہوتے ہیں مگر حقیقت نہیں ہوتے۔“ وہ آہستگی سے گویا تھی۔ ”آرٹ، فنون لطیفہ پر محض دل بہلانے کے طریقے ہیں۔ محض خود فریبی۔ ہزاروں بڑے آرٹسٹ اس دنیا سے گناہ چلے گئے۔ ان کے شاہکار مٹی میں یونہی دفن ہو گئے۔ کیا مل گیا ان کو۔ اس سے تو بہتر تھا کوئی اچھا بزنس کر لیتے۔“ آخر میں وہ جیسے خود پر ہنسی تھی۔

”قدرت کے کارخانے میں ایک سے بڑھ کر ایک شاہکار ہے۔ اللہ سے بڑا کوئی فنکار نہیں۔ اس کا ہر آنے والا شاہکار پہلے سے مکمل مختلف اور اچھوتا ہوتا ہے۔ اس تخلیق کار کے نور کا تھوڑا سا حصہ ہم میں ہے جو روح کہلاتا ہے۔ سو ہم سب کے اندر تھوڑا تھوڑا فنکار بسا ہے۔ جو گناہ اس دنیا سے چلے گئے کیا خدا نے ان کی محنت کا کوئی ثمر نہیں رکھا۔ کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ انصاف کرنے والا یوں بے انصافی کرے۔“ وہ رکا۔ صلہ ساکت سی اسے تک رہی تھی۔ ذہن میں لگی گرہیں کوئی آہستہ آہستہ کھول رہا تھا۔ وہ دم سادھے اس کے بولنے کا انتظار کر رہی تھی۔

”ایسا نہیں ہے صلہ۔ کوئی قدرتی منظر آپ کو انسا پڑ کرتا ہے۔ آپ کا جی چاہتا ہے کہ آپ اس منظر کو قید کر لیں۔ تصویر بنا لیں۔ یا اس کی تعریف میں شاعری کریں۔ حالانکہ وہ لمحہ ہی آپ کے لیے آپ کی پینٹنگ، شعر، یا کہانی سے زیادہ قیمتی ہوتا ہے۔ وہ منظر آپ کے وجدان میں اتر کر روح کی طرف کھلنے والی کھڑکی کھول دیتا ہے۔ کہ جب بھی جی گھبرائے تو ستانے کو اس خوبصورت یاد کا بچھونا اوڑھ کر سو جائیں یا جس کھڑکی کے کھل جانے سے روح کو تازہ ہوا میسر آ سکے۔ روح کو اس قدرت سے جدا کرنا آسان نہیں ہے۔ یہ قدرت کے ذریعے عطا کردہ وجدان ہوتا ہے جو روح کو سیراب رکھتا ہے اور نور کا وہ ذرہ اپنے منبع، اپنے مرکز کو بے اختیار یاد کراٹھتا ہے۔ اس سے ملنے کو تڑپتا ہے۔ تبھی تو موت کو صوفیاء کرام منزل کہتے ہیں کہ یار سے ملنے کا یقین موت کو بھی ان کے لیے خوبصورت بنا دیتا ہے۔“

پرسوج انداز میں رک رک کر کہتا بالاج جب خاموش ہوا تو اسے یوں لگا جیسے یکدم ساری دھند چھٹ گئی۔ وہ بے یقینی سے اسے تک رہی تھی۔ اس نے کتنی آسانی سے اسے ذہن میں اٹھتے سارے سوالوں کے جواب دے ڈالے تھے۔ سب کچھ یکدم اجلا اجلا سا دکھائی دینے لگا تھا۔

”ایسے کیا دیکھ رہی ہو۔ یہ میں نے نہیں کہا بھی کسی کتاب میں پڑھا تھا اور تھوڑا بہت تو تمہاری کہانی سے بھی سیکھا ہے۔ خاص طور پر عنایا جہانگیر کا کردار اب تک میرے اعصاب پر سوار ہے۔“ وہ ہلکے پھلکے انداز میں بولا تو وہ کھل کر مسکرا دی۔ اس نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ اس کہانی کا ریویو وہ بالاج علی شاہ سے سنے گی۔ بے اختیار دل بھر آیا تھا۔

”کتنی عجیب بات ہے تم نے رمنا کو عنایا جیسی ہوشیار خاتون کے قریب تو رکھا مگر اسے ابرار جیسے بند کے ہتھے کیوں چڑھنے دیا۔“ وہ سنجیدگی

سے پوچھ رہا تھا۔ ”ان دونوں کی محبت کچی تھی مگر انجام اتنا برا کیوں لکھا۔“

”کسی کو تو تھنہ تنہا رہنا تھا۔ ہر کوئی فاروق، بتول جیسا خوش نصیب تو نہیں ہوتا نہ۔ ویسے بھی ابرار کا کامپلیکس اور بیوی کی بے وفائی نے اسے سخت اور سفاک کر دیا تھا۔ سو نہ وہ رہنا کو محبت دے سکا اور نہ اس پر یقین کر سکا۔“ اس کی نظروں میں بے ساختہ شیریں ہما کے نکاح کا منظر گزرا۔ وہ اسی منظر میں کھوسی گئی۔ جبکہ بالاج خاموشی سے اس کی بات پر غور کر رہا تھا۔

”تم اس مسودے پر کام کرو۔ میرا مطلب کہ ایسے کام کو منظر عام پر آنا چاہیے۔ جو مدد چاہیے میں دینے کو تیار ہوں۔ مرضی کی کاسٹنگ کرو۔ ہدایتکاری کرلو۔ وہ یوں ضائع کرنے والا مسودہ تو نہیں ہے۔“ وہ متوازن لہجے میں کہتا کسی پروڈیوسر کی طرح لالچ دے رہا تھا۔ البتہ دل و دماغ کی سوئی اس کی رہنا اور ابرار والی آخری بات پر اڑی تھی۔

”میں کسی پر بھی کام کر لوں مگر اس پر نہیں۔“ وہ غم آنکھیں لیے دو ٹوک انداز میں بولی۔ بالاج گہری سانس لیتے تاسف سے سوچنے لگا۔ اس لڑکی کو واقعی اپنی چیزیں خراب کرنے کی عادت تھی۔ ”تمہیں پتا ہے زرینہ جس فلم پر کام کر رہی تھیں وہ بند ہو گئی ہے۔“ بالاج بغور اسے دیکھ رہا تھا۔ اسے حیرت کا شدید جھٹکا لگا تھا۔ وہ فلم زرینہ کا خواب تھی۔ جس کے لیے انہوں نے کئی سال چھوٹے سے لے کر بڑے تھیز تک سندھ کا کونا کونا چھان مارا تھا محض اس فلم کی مرکزی کردار نبھانے والی صنم خٹک کے لیے۔ اور صنم خٹک نہ صرف ایک خوبصورت اداکارہ تھی بلکہ منجھی ہوئی کلاسیکی رقاصہ بھی تھی۔ اندرون سندھ کے آرٹ کونسل کے تحت ہونے والے چھوٹے سے پلے میں راج رنگی کا رول کرتے وقت زرینہ نے اسے دیکھا تھا۔ یہ صرف زرینہ کی فلم نہیں تھی بلکہ اس میں شامل وہ چار نئے چہرے تھے جو انہوں نے ذاتی محنت سے کچھڑے میں کنول کی طرح نکالے تھے۔ وہ بھیگی نگاہیں لیے ساکت سی اسے تک رہی تھی۔

”تمہاری سوکا لڈ سپر شار نے پروڈیوسر زکو بالکل خالی کر کے ہری جھنڈی دکھا دی ہے۔“ اس کے طنز یا کہنے پر صلہ کی نظر میں ڈبڈبا گئیں۔ بالاج لب بھینچے اسے دیکھ کر رہ گیا۔

دفعاً اس کی پلک چھپکی اور ایک آنسو ٹوٹ کر اس کی گود میں دھرے ہاتھ پر آگرا۔ بالاج عجیب سے انداز میں کبھی اس آنسو اور کبھی قریب دھرے اپنے سیاہ ہاتھ کو دیکھ رہا تھا۔ صلہ نے چونک کر اپنے ہاتھ کو دیکھا پھر بالاج کو۔ وہ اب بھی اسی تھکن زدہ سے انداز میں ایک نظر آنسو اور ایک نظر اپنے ہاتھ پر ڈالتا۔

”یہ آنسو بھی میری چھڑی سے زیادہ سفید ہے۔“ اس کی بھاری آواز گونجی تو صلہ گنگ رہ گئی۔ وہ ایک نظر صلہ پر ڈالتا کھڑا ہو گیا اور پھر لمبے لمبے ڈگ بھرتا چلا گیا۔ صلہ کے دل کو کچھ ہوا تھا۔ پہلی بار اس نے اس کے دکھ کو دل سے محسوس کیا تھا۔ وہ محض اسے جانتا دیکھتی رہ گئی یہاں تک کہ وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

.....☆.....

وہ قد آدم کھڑکی کے پار کھڑی نیچے دیکھ رہی تھی۔ پورچ میں سفید کرولا پارک کی جا چکی تھی۔ فرنٹ سیٹ سے بیگ اٹھاتا عذیر باہر نکلا اور گاڑی لاک کرنا اندر بڑھ گیا۔

اس کی نظریں گاڑی پر جم سی گئیں۔ ایک بھولی بھنگی یاد ذہن کے درپچوں سے آنکرائی تھی۔

”اس گاڑی سے کوئی ہمدردی نہیں رہی آپ کو یا کہاڑ میں دینے کا ارادہ ہے۔“ زرینہ کے اسے چابی تھانے پر وہ شرارت سے چبکی تو وہ حیران ہوئیں۔

”کیوں بھی۔ تم نے ایک دفعہ کہا تھا کہ تمہیں بہت اچھی ڈرائیونگ آتی ہے۔“

”انہوں نے تو سرپس لے لیا۔ چل سلا حیری تو نکل پڑی۔“ اس نے سر کھاتے خود کلامی کی۔ زرینہ مشکوک سی ہوئیں۔

”ادھر دیکھو ذرا۔ کیا کہہ رہی تھیں تم؟“ انہیں اس کی یہ خود کلامی والی عادت بہت کیوٹ لگتی تھی۔ ایک بار تو اسی عادت کی بدولت وہ ایک سینئر ایکٹر کے ہاتھوں بال بال پٹنے سے بچی تھی۔ کہا تو اس نے سچ تھا۔ مگر وہ از حد غصے میں آ گئے تھے اور زرینہ مسکراہٹ دہاتی اسے بچانے کو دپڑی تھیں۔ وہ بیچ میں نہ آتیں تو وہ تو گئی تھی کام سے۔

”کچھ نہیں بس میں کہہ رہی تھی کہ ذرا اپنے یہ لان کے سائیڈ پر لگے گملے ہٹوالیں۔ گیٹ سے گاڑی نکالنا خاصا مینیکل کام ہے اور یہ گملے بیچارے کہاں سمجھیں گے۔“ وہ بڑے آرام سے کہتی ڈرائیونگ سیٹ پر براجمان ہو گئی۔ زرینہ جو موبائل پر کچھ چیک کر رہی تھیں نا کبھی کے عالم میں فرنٹ سیٹ پر آ بیٹھیں۔

”یہ تم نے ابھی کیا بولگی ماری تھی۔“ انہوں نے ایس ایم ایس لکھتے پوچھا۔ مگر تب تک صلہ ریورس گیر لگا چکی تھی۔

”تمہیں واقعی ڈرائیونگ آتی ہے نا۔“ ان کا ایس ایم ایس آخری مراحل پر تھا تو مصروف سی پوچھ بیٹھیں۔

”ارے کوئی ایسی ویسی.....“ اس نے کلچ دباتے فل ایکسیلیٹر دبایا۔ گاڑی ایک جھٹکے سے پیچھے ہٹ گئی۔ وہ سینڈ کا بشن دہا رہی تھی کہ جھٹکے سے موبائل ہاتھ سے چھوٹ گیا۔

”لا حول ولا قوۃ..... آہستہ ریز دو بھئی۔“ ان کا دل دہل گیا۔ وہ گیٹ کے ایک طرف والی دیوار سے ٹکرانے والے تھے کہ اس نے زوردار بریک لگائی۔ ڈرائیوے کے کنارے لگے گملے جو کہ اب شہیدوں کی صف میں شمار ہو گئے تھے۔ زرینہ کو منہ چڑا رہے تھے۔ وہ ابھی افسوس بھی نہ کر پائی تھیں کہ صلہ نے پہلا گیر لگایا اور پھر گاڑی کو فل ریز دی۔ گاڑی کا رخ لان کی جانب ہو گیا تھا۔ گاڑی ایک ایک جھٹکے سے بڑھی۔ اگلا نشانہ لان کے شروع میں لگے گملے تھے۔ زرینہ جو ڈیش بورڈ پکڑے بیٹھی تھیں یکدم ایکشن میں آئیں اور ہینڈ بریک لگا دی۔ گملوں سے چند انچ کے فاصلے پر گاڑی ایک جھٹکے سے رکی تھی۔ گاڑی رکتے صلہ دروازہ کھول کر باہر نکلی اور اندر کجانب دوڑ لگا دی۔

”رکو صلہ کی بچی۔“ وہ موبائل اٹھتی باہر نکلیں۔

”آپ کو کس نے کہا تھا میری بات پر یقین کریں۔ مجھے گاڑی چلانی نہیں آتی۔ مگر مجھے شوق بہت ہے۔ جب ہی موقع ملے گا چلاؤں گی

ضرور۔“ وہ محفوظ فاصلے تک بھاگتی رک کر بولی تھی۔ پھر اندرونی دروازے سے اندر جاتے قدم یکدم لڑکھڑائے۔ چوکھٹ پر Jack خطرناک تاثرات لیے کھڑا تھا۔ ادھر زریہ بچے کچے گملوں کا جائزہ لے رہی تھیں۔ وہ مزے سے پھسکڑا مار کر بیٹھ گئی۔ ”او میرے بھائی..... پلیز جانے دے۔ دیکھ میرا بیگ اندر ہے۔ اور بنا کرایے کے میں بھاگ بھی نہیں سکتی اور اگر یہی رہی تو تیرے یہ جوزرینہ میڈم ہیں نایہ اپنے مہنگے گملوں کے پیسے مجھ سے نکلوائیں گی اور تجھے تو پتہ ہے میں کتنی غریب ہوں۔“ وہ التجا کرتی قدرے فاصلے سے اس سے مخاطب تھی جو وہاں سے ہٹنے کے موڈ میں نہیں تھا۔ اسے پچکارنے یا ہاتھ لگانے کی ہمت اس میں اب بھی نہیں تھی۔ ”مان جا پلیز..... میں تیری پرابلم سمجھ سکتی ہوں۔ پر میں کیا کروں.....“ وہ کی جیک کے تاثرات قدرے نرم پڑ چکے تھے یا اسے ایسا لگا تھا۔ ”آئی نو تو مجھ سے بہت جیلس ہے کیونکہ وہ تجھ سے زیادہ مجھ سے پیار کرتی ہیں۔ میں تیرا دکھ سمجھ سکتی ہوں۔“ اس نے مصنوعی سرد آہ خارج کی۔ پیچھے کھڑی زریہ متبسم سی اس کی باتیں سن رہی تھیں۔ ”اگر تو انسان ہوتا تو میں تیری سفارش کر دیتی مگر آپ جناب تو وہ ہیں جن سے مجھے بھی ڈر لگتا ہے۔ چلو شاباش ہٹ جاؤ۔“ وہ تسلی سے اٹھ کھڑی ہوئی جبکہ جیک خونخوار انداز میں بھونکا تو اس کے اوسان خطا ہو گئے۔ وہ غصے سے اسے گھورتا اس پر بھونک رہا تھا۔

”ریلیکس جیک۔ اور Here۔“ پیچھے کھڑی زریہ نکل ہوئیں۔ جیک اسے غصیلی نظروں سے نوازتا زریہ کی گود میں چڑھ گیا۔ وہ اس کا سر سہلائے لگیں۔

”بھی ہم غریب لوگوں سے پیسے نہیں لیتے۔ مگر یہ جو آپ نے میرے فیورٹ گملوں کو شہید کیا ہے۔ ان کی باقیات کونا سمیٹے گا۔ مالی چھٹیوں پر ہے۔ چلو شاباش صفائی کرو۔“ وہ مزے سے حکم دیتی لائن میں کرسی ڈال کر بیٹھ گئیں۔

”اس سے تو اچھا تھا آپ پیسے یہ لے لیتیں۔ اب اتنی بھی غریب نہیں ہوں۔ میرے تایا کی ہے اونچی حویلی.....“ وہ برا سامنے بناتی نیچے لائن میں اتر آئی۔ زریہ مسکراتیں جیک سے کوئی بات کرنے لگیں۔

”ویسے دوبارہ یہ حسین موقع کب ملے گا۔“ وہ جاتے جاتے مڑی پر جوش سی پوچھ رہی تھی۔

”تم جاتی ہو یا.....“ انہوں نے جیک کی طرف اشارہ کیا جو پہلے ہی اس کے خون کا پیاسا تھا۔

”جاری ہوں۔ ناراض کیوں ہوتی ہیں۔ کدھر ہے جھاڑو.....“ وہ جھاڑو لینے پورچ میں چلی گئی۔

”کلیوگ ہے بھی گھور کلیوگ۔ مستقبل کی اتنی بڑی رائٹر، ڈائریکٹر، شیف اور ایکٹر سے یہ ظالم سا جھجھکاؤ پھر دار ہا ہے۔“ وہ اونچی آواز میں بڑبڑاتی کام کر رہی تھی۔

”شیف اور ایکٹر کی تو بات ہی مت کرو۔“ وہ ہنستیں صحیح کرنا نہ بھولیں۔

”یہ سننے سے پہلے میرے پران کیوں نہ چلے گئے ہائے.....“ ہا کمرے میں داخل ہوئی۔

”صلہ کیا کر رہی ہو؟“ وہ سوچوں میں گم یکدم چونک کر مڑی تھی۔ ”ہاں۔“ پھر س محل کرنیبل کی جانب چل دی۔ تایا ابا کے اصرار پر وہ تینوں کہنی کے دیے گھر کی بجائے ان کے گھر چند دن رہنے آئے تھے۔ ”کہاں جا رہی ہو؟“

”نسیم انگل نے کچھ چیزیں منگوائی ہیں۔ وہی لینے جا رہی ہوں۔“ وہ مصروف سی بیگ بند کرتے ہوئی۔

”اکیلی بکپوں جا رہی ہو۔ شیری چھوڑ آئے گا۔ یا عذیر سے کہوں.....“

”نہیں.....“ صلہ نے دو ٹوک انداز میں کہا تو ہا خاموشی سے اسے گھور کر رہ گئی۔ ”وجہ؟“ وہ سینے پر بازو لپیٹے پوچھ رہی تھی۔ صلہ ہچکچائی۔

”ہم تمہیں پتا ہے مجھ سے یہ مجبوری کے یاز بروستی کے رشتے نہیں نبھائے جاتے۔“ وہ بے بس سی کھڑی تھی۔ ہانپتی سی اسے دیکھ رہی تھی۔

”تم پلیز یہ معاملے ڈیل کروادو یا ختم کروادو۔ مجھے ابھی اس شادی وادی کے جھنجھٹ میں نہیں پڑنا۔“ پھر کیا چاہتی ہو تم؟“ وہ تیز لہجے میں

بولی۔ دو مہینے سے مرغی کی وہی ایک ٹانگ وہ بیزار سی آگئی تھی۔ ”کام میں تمہارا دل نہیں لگتا، لکھنا تم نے بند کر دیا۔ کبھی نہ کبھی شادی تو تم کو کرنی ہی ہے۔“

جو تمہارا حال ہے اس سے لو میرج کے تو آ جا رہی نہیں۔ بہتر نہیں کہ تم خاندان میں ہی شادی کر لو۔ بہ نسبت کسی اجنبی سے شادی کرنے کے اور

خاندان میں یہ آخری لڑکا بچا ہے۔“ وہ بناؤ کے ایک ہی سانس بولتی گئی۔ صلہ کے اعصاب میں جھنجھٹا اٹھے۔

”I just dont care.....“ وہ جھنجھلا کر باہر چل دی۔ ہما تاسف سے سر جھٹکتی رہ گئی۔ باہر جائے اس کی نظر رائٹنگ ٹیبل پر پڑی۔

وہاں چند کاغذات پڑے تھے۔ انہیں الٹ پلٹ کر دیکھتی وہ مسکرا دی۔ وہ خاصا لمبا پیرا گراف تھا۔ تو صلہ رحمنا نے لکھنا شروع کر دیا۔ ایک رات میں

اتنی تبدیلی۔ شاید اس بار سمندر اس کے لیے کوئی خوبصورت سیپ چھوڑ گیا تھا۔ اس کا دل ڈھیروں طمانیت سے بھر گیا۔ لیکن اگلے لمحے وہ متفکری سوچ

میں پڑ گئی۔ عذیر اس رشتے پر خاصا سنجیدہ تھا اور دونوں خاندان جلد از جلد اس فرض سے سبکدوش ہونا چاہتے تھے۔ یہ تو داد کی بدولت معاملہ لنگ گیا

تھا۔ صلہ کے انکار کے بارے میں صرف امی وہ اور داد وہی جانتے تھے اور وہ تینوں کیسے سب سنبھال رہے تھے یہ وہی جانتے تھے۔ اسے شرجیل سے

بات کرنی چاہیے یا نہیں۔ اسی شش و پنج کا شکار وہ باہر نکل گئی۔



حاضر غائب

”حاضر غائب“ محترم ”اظہر اقلیم“ صاحب کی شگفتہ اور نستی مسکراتی تحریر۔ قہقہوں سے گندمی ہوئی ایک ایسی تحریر جو

اداس اور غمگین قارئین کے لئے غم گسار کہانی ہے۔ ایک ایسے شخص کا فسانہ جسے قدیم نسخوں کی ایک کتاب مل گئی تھی اور اس کتاب کے سہارے

اُس نے دوائے بہادری، دوائے دیانت اور دوائے غیاب تیار کر لی تھی۔ پھر ان ادویات کے استعمال کے بعد اُس پر کیا گزری، کس کس طرح

رسوائی اور ٹھکانی ہوئی اور کیا کیا ستم سہنے پڑے یہ سب جاننے کے لئے پڑھیے ناول ”حاضر غائب“۔

”حاضر غائب“ کتاب گھر پر جلد آ رہا ہے۔ جسے طنز و مزاح سیکشن میں دیکھا جاسکتا ہے۔

نسیم انکل کی مطلوبہ چیزیں لینے کے بعد وہ بک اسٹور آگئی۔ کتابیں دیکھتے اسے وقت کا احساس ہی نہیں ہوا۔ شام سے گہری رات ہو رہی تھی۔ وہ کوئی کتاب لے کر پلٹ رہی تھی کہ رک گئی۔ دوسرے ریک سے کتاب لیتا وہ خوب روٹا کٹا نو جوان یکدم مڑا تھا اس کی گود میں موجود موٹی موٹی کتابوں میں سے ایک کتاب گر پڑی تھی اور وہ عین صلہ کے پاؤں پر گری تھی۔ وہ احتیاطاً پہلے ہی رکی تھی اس کے باوجود وہ کراہ کر رہ گئی۔

”اوہ۔ ایم سوسوری۔ میں نے دیکھا نہیں۔“ وہ کھڑا کھڑا معذرت کر رہا تھا۔ صلہ ایک نظر اس کے ہاتھ میں موجود موٹی موٹی 6 کتابیں دیکھ خود ہی نیچے گری کتاب اٹھانے جھک گئی۔ بل پے کرتی خاتون شور سن کر ٹھکیں۔ چھوٹے سے بک سٹور پر رش اور شور نہ ہونے کے برابر تھا۔ وہ اس جانی چلی آئی۔ ”کیا ہوا ولی بخت.....“ میم یہ کتاب۔ ”ولی بخت کچھ کہتا رک گیا۔ وہ خاتون صلہ کو حیرانی سے دیکھ رہی تھیں۔ ایک نظر باری باری ان دونوں پر ڈالتا وہ خاموش ہو گیا۔

”صلہ تم یہاں..... لاہور سے کب آئیں۔“ وہ خوشگوار حیرت سے کہتیں اس کے گلے لگ گئیں۔ صلہ دم سادھے کھڑی تھی۔ اس کے دونوں بازو پہلو میں گرے تھے۔

”تھینک گاڈ تم ٹھیک ہو۔“ وہ اس کا چہرہ تھامے متکسری کہہ رہی تھیں۔ صلہ کی نظروں میں استعجاب در آیا۔

”ساری باتیں یہیں کریں گے۔ کچھ تو رحم کریں میم۔“ ولی بخت موٹی موٹی کتابوں کا وزن سہہ نہیں پایا سوتیزی سے بولا۔ وہ چونک کر اس کی طرف مڑیں۔

”کچھ تو خدا کا خوف کرو۔ اتنے بڑے کٹے ہو کر چار کتابیں نہیں اٹھائی جا رہیں تم سے۔“ انہوں نے خوشدلی سے اسے گھر کا۔ وہی خوشدلی جوان کا خاصا رہی تھی۔ صلہ دم بخود انہیں دیکھ رہی تھی۔ یہ الوژن تو نہیں تھا۔

”ان چار کتابوں کا حجم بھی تو دیکھیں۔“ وہ بیچارگی سے بولا تو زرینہ ہنس دیں۔ اور حیران و پریشان سی صلہ کا ہاتھ تھامے باہر کی جانب چل دیں۔ صلہ کسی ٹرانس کی سی کیفیت میں ان کے ساتھ چلی جا رہی تھی۔

پارکنگ میں پہنچتے انہوں نے اسے فرنٹ سیٹ پر بٹھایا اور خود ڈرائیونگ سیٹ پر آ بیٹھیں۔ ولی بخت کتابیں ساتھ رکھے مودب سا بیچھے بیٹھا تھا۔ زرینہ نے اسے اس کے گھر ڈراپ کیا اور گاڑی اپنے چھوٹے سے مگر بہت خوبصورت Ctas & Dogs ہاؤس کی راہ میں ڈال دی۔

”تم اکیلی گھر سے باہر کیوں نکل آئی۔ آئی نو کہ خطرہ ٹل گیا ہے۔ مگر پھر بھی احتیاط بہتر ہے۔“

”خطرہ؟“ صلہ حیران ہوئی۔ وہ کیا کہہ رہی تھیں۔

”ہاں وہ ہمارے عین شادی سے دو دن پہلے تمہارے بھائی سے شادی کر لی۔ ظاہر ہے اس میں اعفان کی بہت تذلیل ہوئی۔ وہ اسے سزا دینا چاہتا تھا۔ اور اس کے لیے وہ تمہیں کڈ نیپ کرنے کے منصوبے بنا رہا تھا۔ اس کی شادی کے باعث ہم نے پہلے ہی اس کی شوٹنگ ڈینس لیٹ رکھی تھیں۔ پھر ایک پٹائی سے اس کی عقل ٹھکانے تو آ گئی۔ مگر انسان کا کہاں پتا چلتا ہے۔ اس لیے دوبارہ اکیلے مت نکلتا۔“ وہ نارمل سے انداز میں گویا تھیں جیسے ان کے درمیان کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ صلہ کے سوچ کر ہی رو ٹگٹے کھڑے ہو گئے تھے۔ کڈ نیپ کر کے وہ اس کا کیا حشر کرتا۔ ساری زندگی اس کی حالت دیکھ کر ہما

احساس جرم میں گھری رہتی اور کبھی خوش نہ رہ پاتی۔ مگر اس سارے میں وہ کہاں تھی۔ بدلہ لینے والے یا دھوکہ دینے والے کے درمیان پسنا اسی کا نصیب کیوں تھا۔ یکدم ساری دنیا زہر لگنے لگی تھی۔ اس کے لیے کچھ کیوں نہیں تھا۔ اپنی ذات کا کہیں تو نشان ملے۔ وہ ہونٹ بھیجنے باہر دیکھ رہی تھی۔ دفعۃً زرینہ کا فون بجا۔ ”جی تقی صاحب۔“ وہ خوشگوار سے انداز میں گویا ہوئیں۔

”جی جی ابھی کل ہی تو لوٹی ہوں کشمیر سے۔“ وہ دوسری طرف بات سن کر کہیں۔ ”بات تو بہت معمولی سی تھی مگر آپ کو تو پتہ ہے ہمارے دیہاتی اور قبائلی لوگوں کی سوچ کس قدر کڑی قسم کی ہے۔“ ”جی اللہ کے فضل سے معاملہ بنالیں اب پوسٹ کا کام رہ گیا ہے۔ اس کی تو آپ فکر ہی نہ کریں بہت اچھا ایڈیٹر ہے میرے پاس۔“ وہ صلہ کی جانب دیکھ کر مسکرائیں۔ صلہ نا کجی کے عالم میں سن رہی تھی۔ اس بے اختیار بالاج کی کہی بات یاد آئی تھی۔ وہ ابھی۔

”اچھا تقی صاحب میں ڈرائیونگ کر رہی ہوں۔ بعد میں بات ہوگی۔ اللہ حافظ۔“ فون رکھتے انہوں نے تیزی سے موڑ کاٹا۔

”آپ کی فلم تو بند نہیں ہو گئی تھی۔“ وہ گاڑی پورچ میں کھڑی کر رہی تھیں جب صلہ بے اختیار پوچھ بیٹھی۔

”اللہ نہ کرے۔“ گاڑی بند کرتے وہ دہلی سی گئیں۔ ”تمہیں کس نے کہا۔“

”بالاج نے.....“ وہ جھجکی۔ زرینہ کو تاؤ آ گیا۔

”اسکی تو تم بات ہی نہ کرو۔ عین شوٹنگ والے دن اس نے اعفان کی وہ پٹائی کی اور ساتھ میرے اسٹنٹ کو بھی لگا لیا۔ پورے دو ہفتے اس کے زخم بھرنے کا انتظار کرتے رہے اور اس نے وجہ تک نہیں بتائی۔ بس مار لگا کر چلا گیا۔ اس وقت ہم گوٹھ میں شوٹنگ کر رہے تھے۔ وہ تو بعد میں ولی بخت نے مجھے ریزن بتایا تو میرے تو ہوش ہی اڑ گئے۔ مگر پھر کشمیر میں جو حال ہوا۔ اس میں تو ہمیں اپنی بھی ہوش نہیں تھی۔“ وہ دونوں لاؤنج سے گزرتیں کچن میں چلی آئیں۔ زرینہ نے چائے کا پانی چڑھایا۔

”کیا مطلب.....“ صلہ کو ایک لفظ پلے نہ پڑا۔ کہ ابھی اس پر خود ترسی والا بھوت پھر سوار ہو گیا تھا۔ وہ اس کی جانب مڑیں۔ وہ چھوٹے سے ڈائننگ ٹیبل کی کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی تھی۔

”یہ ولی بخت جو ابھی کتابیں اٹھائے کھڑا تھا۔ اس کا تعلق بالاج کے کزن کے گوٹھ سے ہے۔ وہی وڈیرہ سٹم این آل دیٹ..... پڑھنے کا شوق تھا سو شہر آ گیا۔ بی اے کے بعد پروڈیوسر صاحب کے اسٹنٹ ہو گیا۔ مگر کراچی میں وہ ان آفیشلی بالاج کے لیے جاسوسی کرتا تھا۔ خاص طور پر اعفان کی۔ فلم کے سلسلے میں جس گوٹھ میں ہمیں کام تھا وہ ولی بخت کے گوٹھ کے قریب تھا سو وہ میرا اسٹنٹ لگ گیا۔ ہٹا کتا دیہاتی ہے سو بس پردہ مار کٹائی کے کام وہ اسی سے کرواتا تھا۔“ وہ ٹیبل پر دوسری چیز نکال کر بیٹھیں ساری تفصیل سے آگاہ کر رہی تھیں۔ جبکہ خاموش بیٹھے صلہ کے ذہن میں جھماکے سے ہو رہے تھے۔ جیک دم ہلاتا یکدم آیا اور زرینہ کی گود میں چڑھ کر بیٹھ گیا۔

”پتہ ہے تمہیں سب سے زیادہ جیک نے مس کیا تھا۔“ صلہ خیالوں سے چونکی۔ پھر ایک نظر جیک اور ایک نظر زرینہ پر ڈالتے سیدھی ہوئی۔

”کیوں آپ نے مس نہیں کیا۔“ وہ آس و نراس والی کیفیت میں پوچھ رہی تھی۔

”ارے چائے تو یاد ہی نہیں۔“ وہ جیک کو گود سے اتارتے چولہے کی جانب بڑھیں۔ صلہ دل مسوس کر رہ گئی۔ وہ خلا تھا یا خلیج جو پھر سے ان کے درمیان در آئی تھی۔

”آپ مجھ سے ابھی بھی ناراض ہیں؟“ وہ ہمت کر کے کاؤنٹر کی طرف چلی آئی۔ جس کے پار کیوپ میں چائے ڈالتی زرینہ کے ہاتھ رکے۔

”نہیں تو.....“ انہوں نے نارل سے انداز میں کہا۔ صلہ کا دل سہم سا گیا۔

”ادھر دیکھ کر بتائیں۔“ زرینہ کپ لے کر اس کی طرف آئیں اور مسکرا دیں۔

”نہیں صلہ میں تم سے کبھی بھی ناراض نہیں تھی۔ مگر مجھے تمہارے رویے بہت دکھ پہنچایا تھا۔ تم نے مجھے اس قابل بھی نہیں سمجھا کہ تم مجھے کوئی

صفائی دیتیں۔“ وہ دکھ سے بولی تھیں۔ کاؤنٹر پر بڑے چائے کگ سے نکلتے بھاپ عجیب و غریب شکلیں بنا رہی تھی۔

”آپ اس وقت اتنے غصے میں تھیں۔“ وہ کمزور سے لہجے میں بولی۔

”تو.....؟“ زرینہ سینے پر بازو لپیٹے استفسار کر رہی تھیں۔

”تو..... غصے میں انسان وہی دیکھنا اور سننا چاہتا ہے جو وہ اس وقت محسوس کر رہا ہوتا ہے۔ میں کچھ کہتی بھی تو کیا آپ یقین کرتیں۔“ اس

کے انداز میں گھبراہٹ سی تھی۔

”تم کیسے کہہ سکتی ہو یہ بات..... کچھ نہ کہہ کر تم نے زیادہ دکھ پہنچایا مجھے۔ کیا میں خفا بھی نہیں ہو سکتی تھی تم سے۔“ وہ غصے پر ضبط کرتیں

بولیں۔ کاؤنٹر پر پڑی چائے پر سے بھاپ نکلنا بند ہو گئی تھی۔ دونوں کو ہی ٹھنڈی پڑتی چائے کا خیال نہیں تھا۔

”میں کیا کہتی زرینہ، لکھائی میری، آواز میری..... صفائی دیتی بھی تو کیا۔“ وہ بے بس سی کھڑی تھی۔ زرینہ لب بھینچ کر رہ گئیں۔

”یہی تو مسئلہ ہے تمہارا پس اتھ..... تم خود سے ایک چیز فرض کر کے بیٹھ جاتی ہو اور پھر ایمان کی حد تک قائم و دائم رہتی ہو۔ میں بھی انسان

”I wanted you to apologize at least“ وہ خفگی سے بولیں۔

”بات نیت کی تھی۔ آپ نے میری نیت پر شک کیا تھا۔ میں معذرت کرتی اور ضرور کرتی اگر کسی لمحے بھی میرے دل میں چور ہوتا۔ وہ

الفاظ میں نے ہی تو لکھے تھے۔“ وہ مصر تھی۔ زرینہ اسے کپ تھماتی لاؤنج میں آگئیں۔ وہ پیچھے لپکی۔

”خیر جو ہوا سو ہوا..... اب تمہارا آگے کیا پلان ہے۔“ وہ مطمئن سی صوفے پر بیٹھتی بولیں۔

”پہلے آپ بتائیں آپ ناراض تو نہیں ہیں۔“ اس نے کھڑے کھڑے پوچھا۔

”نہیں بابا.....“ وہ مسکرائیں۔ ”یہ بات مجھے جلد ہی سمجھ آ گئی تھی کہ بعض دفعہ انسان جذبات میں ایسی باتیں کہہ جاتا ہے جو حقیقت میں وہ

کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ مگر تم صدا کی ڈرامے باز، خواہ مخواہ سچویشن کو اتنا ڈریگ کیا۔ اور ادھر کشمیر میں سر کھجانے کی فرصت نہیں تھی۔ ورنہ اس

طرح بغیر اجازت لاہور چلے جانے پر تمہارے میں نے وہ کان کھینچنے تھے کہ عقل ٹھکانے آ جاتی تمہاری۔“ وہ شگفتگی سے گویا تھیں۔ صلہ کھلکھلائی۔

”بس پھر ٹھیک ہے۔“ اس نے کپ میز پر دھرا۔ اور ان کا بازو تھام لیا۔ ”چلیں مجھے گول گپے کھانے ہیں اور اس کے بعد انسکریم بھی۔“

”ارے چھری تلے دم لو..... چائے تو پینے دو۔“ وہ گڑبڑائیں۔

”چھوڑیں چائے وائے۔“ اس نے انکا کپ پکڑ کر میز پر رکھا اور پاس بڑا انکا بینڈ بیگ اٹھالیا۔ انہیں اٹھتے ہی بنی۔

”ایک منٹ۔“ وہ پورچ میں آتے رکیں۔ ”کیا کہا تم نے گول گپے پھر آسکریم۔“ وہ کمر پر ہاتھ رکھے اس کی خبر لے رہی تھیں۔ صلہ نے

جواباً معصومیت سے اثبات میں سر ہلایا۔ ان کا بینڈ بیگ ابھی بھی اس کے پاس تھا۔

”بالکل نہیں..... تمہارا گلا خراب ہو جاتا ہے۔ چلو تمہارے فیورٹ ریستورنٹ میں ڈنر کرتے ہیں۔“ وہ گاڑی کی طرف بڑھیں۔

”آپ اکیلی ڈنر کریں پھر..... میں خود ہی چلی جاتی ہوں گول گپے کھانے۔“ اس نے بیگ سے چابی نکالتے گویا دھمکی دی۔ زرینہ ہنس دیں۔

”یعنی تم خلق خدا پر ظلم کرنے سے باز نہیں آؤ گی۔“ صلہ نے زور سے نفی میں سر ہلایا تو وہ ہنستی سر جھٹکتے گاڑی کی طرف بڑھ گئیں۔ اس کا گلا

خراب مطلب اس کی چھینکوں سے زیادہ بھیا نک آواز کی کھانسی اور ڈرائیونگ تو ویسے بھی ماشاء اللہ تھی اس کی۔ اچھا وہ تمہارے سکرپٹ کا کیا بنا۔ کچھ

دنوں تک بالکل فری ہو جائیں گے ہم۔ پھر اس پر کام شروع کرتے ہیں۔ کیا خیال ہے.....“ وہ ڈرائیو کرتے مصروف سے انداز میں پوچھ رہی تھیں۔

”نہیں زرینہ..... وہ کہانی جس مقصد کے لیے ودیعت کی گئی تھی وہ تو پورا ہو گیا۔ اب نئی وی پر خالی کھیل تماشہ کرنے کا کیا فائدہ۔“ وہ

سپاٹ سے انداز میں بولی تھی۔ بالاج علی شاہ کا بدلا روپ نگاہوں میں پھر گیا تھا۔

”وہ کیسے۔“ زرینہ متعجب ہوئیں۔ صلہ نے انہیں پرسوں کی بالاج سے ملاقات کے بارے میں سب بتا دیا۔ وہ چند لمحے کچھ بول ہی نہ پائیں۔

”سنا تھا کہ دل بدلنے میں ایک لہ لگتا ہے اور کبھی تو سالوں لگ جاتے ہیں۔ آج دیکھ لیا۔ خوش قسمت ہے وہ جو کسی ناقابل تلافی نقصان سے

پہلے ہی اللہ نے اس کے لیے تمہارے لفظوں میں تاثیر رکھ دی۔“ وہ متبسم سی بولیں۔“ ویسے ہے بہت عجیب بندہ۔ ولی بخت بتا رہا تھا کہ ایک ٹنگ چھوڑ دی

ہے اس نے اور کوئی امپورٹ، ایکسپورٹ کے بزنس پر سرمایہ کاری کر رہا ہے۔ خیر جو بھی تھا تمہارے حق میں بہترین ثابت ہوا ہے۔ اگر اس نے اعقان

کے لیے جاسوس نہ رکھا ہوتا تو پھر جو ہونا تھا اس کے بعد ہم میں سے شاید ہی کوئی کبھی خود کو معاف کر پاتا۔ بڑے نامحسوس انداز میں اللہ نے تم دونوں کو

ایک دوسرے کا محسن بنا دیا۔“ وہ خوش دلی سے بولیں۔ ان کے انداز میں گہرا خلوص تھا ہمیشہ کی طرح۔ مگر صلہ کا دل یکدم اداس سا ہو گیا تھا۔ دل میں شاید

بت بہت زیادہ ہو گئے تھے۔ ناقابل رسائی لوگ اسی کے حصے میں کیوں آتے تھے۔ اس نے کہا تھا کہ وہ ابرا جیسا انجام نہیں چاہتا مگر اس نے اس سے تو

پوچھا ہی نہیں کہ کیا وہ رہنا بننا چاہتی تھی یا نہیں۔ اس نے خود کو ٹٹولا تو دل بے حد بے چین و مضطرب ہوا۔ جانے اصل محبت کیا تھی۔ وہ جو اسے جمال

یوسف سے تھی یا وہ جو اپنے محسن کے لیے محسوس کر رہی تھی۔ زرینہ کے مطابق جمال یوسف محض لڑکپن کا کرش crush تھا کیونکہ وہ اس کے آئیڈل سے

قریب تر تھا۔ بالاج کے یوں بدل جانے پر وہ جیسے disillusion ہو چکی تھی۔ دل بھی عجیب صنم کدہ ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اپنے

خواہشات کے بتوں میں ترمیم بھی کرتا ہے مگر حقیقت میں ملنے والی پسندیدہ چیز میں ایک خامی بھی برداشت کرنے سے قاصر ہے۔ بالاج کی محرومی اس

کے وجود میں کسی آکاس نیل کی طرح بہت اندر تک جڑیں پھیلانے لگی۔ وہ اندر سے ابرا جیسا ہی تھا وہ چاہ کر بھی ہادیہ کا کیا بھول نہیں سکتا تھا کیونکہ مرد

صرف اس عورت کو آسانی سے بھول سکتا ہے جسکی زندگی خود اس نے تباہ کی ہو۔ ”میں نہیں چاہتا کہ اب تم کبھی آدرش سے ملو۔“ اس کے کرہ ناک انداز

میں کہتے جملے پردل میں ہوک سی اٹھی تھی۔ اس چار سال کے بچے آدرش سے اسے عجیب سی انسیت تھی۔ اس کے کہے اس جملے کی بازگشت ابھی تک اس کے کانوں میں گونج رہی تھی جسکا صاف مطلب تھا کہ وہ اس کی زندگی سے ہمیشہ کے لیے جارہا تھا یا شاید جاچکا تھا۔ زندگی کا حاصل کیا تھا۔ سب کچھ یا شاید کچھ بھی نہیں۔ اس نے کیا کھویا کیا پایا اس کا حساب اس نے عرصے سے چھوڑ دیا تھا۔ مگر جاتے جاتے وہ پیغام جو وہ دے گیا تھا ساری زندگی اس کے ساتھ رہنا تھا۔ کہ نام، پیسہ یا شہرت کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ بس روح کی طرف کھلنے والی کھڑکی کھلی دینی چاہیے۔ جب تک اسے تازہ ہوا میسر رہے گی تب تک زندگی خوبصورت ہے اور زندگی کے بعد کی دنیا بھی۔ مگر اس سب میں وہ بھی بھول گیا تھا کہ حقیقت میں نہ وہ ابرار ہے اور نہ ہی وہ رونا۔ رونا کو ابرار سے عشق تھا۔ جبکہ صلہ نے کبھی اسے اس نظر سے دیکھا تک نہ تھا۔ جان بوجھ کر آگ میں کودی تھی۔ یہ جانتے ہوئے کہ ابرار کبھی بدل نہیں سکتا۔ صلہ نے ابرار کے کردار کی پر تیں کسی بھی سائیکولوجسٹ کی طرح ترتیب دی تھیں۔ وہ محض اس کا گمان تھا کہ وہ ایسے ہی بی بیو کرے گا اور کبھی سدھر نہیں پائے گا۔ جبکہ حقیقت میں محض ابرار اور رونا کی بیٹی کی ناگہانی موت کے بارے میں پڑھ کر ہی وہ راستہ بدل گیا تھا۔ صلہ کے دل میں ایک گونہ سکون اتر گیا۔ وہ آج سمجھ گئی تھی کہ گمان دھوکہ دیتے ہیں۔ چاہے وہ اچھے ہوں یا برے۔ کبھی نہ کبھی بالاج بھی یہ بات سمجھ ہی جائے گا۔ اور تب تک وہ انتظار کر سکتی تھی۔ اپنی محنت کا صلہ اس نے پایا تھا اب اس کے انتظار کا کیا صلہ دیا جانا تھا اسے بس وہی دیکھنا تھا اور وہ اس بار مایوس نہیں تھی اور نہ ہی اب کبھی اپنے گمان پر بھروسہ کرنے والی تھی۔ شاید اس لیے بھی کہ اب وہ بغیر کسی صلے کے اپنے دل کے فیصلوں پر اعتبار کرنے کو تیار تھی۔

ختم شد

ادہ کھلا گلاب

”ادہ کھلا گلاب“ مجموعہ ہے ایوارڈ یافتہ مشہور شاعر، مصنف، کالمسٹ اور پامسٹ جناب حافظ مظفر محسن کے تحریر کردہ طنزیہ مزاحیہ آرٹیکل کا جوگا ہے بگا ہے مختلف میگزین میں چھپتے رہے ہیں۔ مظفر محسن صاحب اب تک تقریباً ۲۴ کتابیں لکھ چکے ہیں جن میں سفرنامے، شاعری، طنز و مزاح، بچوں کے لئے کتابیں اور دست شناسی شامل ہیں اور ان کی دو کتابیں ”یونائیٹڈ بینک رائٹر گلڈ“ اور ”نیشنل بک فاؤنڈیشن“ ایوارڈ حاصل کر چکی ہیں۔ امید ہے آپ کو یہ کتاب پسند آئے گی۔

”ادہ کھلا گلاب“ کتاب گھر پر دستیاب ہے۔ جسے طنزیہ مزاحیہ مضامین سیکشن میں دیکھا جاسکتا ہے۔